عربوں کی وحدتِ اسلامی کے خلاف سامراجیوں کی خطرناک سازش

تحریر

مجاہد الحسینی

ادارہ صوت الاسلام

شارع جامع مسجد ○ لائل پور

اسرائیل

اور

جماعتِ اسلامی

عربوں کی وحدتِ اسلامی کے خلاف سامراجیوں کی خطرناک سازش

مجاهد الحسینی

ادارۂ صوت الاسلام
شارع جامع مسجد
لائل پور

اشاعت اوّل

اگست ۱۹۶۷ء　　　　قیمت دو روپے ۵۰ پیسے

مطبع ... ... پنجاب پریس۔ وطن بلڈنگ لاہور

طابع ... ... محمد یوسف

ناشر ... ... ادارہ صوت الاسلام لاہور
شارع جامع مسجد

سازشِ افرنگ

ہے خاکِ فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا
مقصد ہے ملوکیّتِ انگلیس کا کچھ اور
قصّہ نہیں نارنج کا یا شہد و رطب کا

حکیم الاُمّت علامہ اقبالؒ

سیاستِ افرنگ

سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں اگر دو مچھلیاں باہم دگر برسرِ پیکار ہوں تو سمجھیئے کہ اس چپقلش میں بھی سیاستِ افرنگ کی کارفرمائیاں ہوں گی۔

جمال عبدالناصر

عرب شہداء کے نام

جنہوں نے

استعماری طاقتوں اور اسرائیلی جارحیّت کا

جرأت مندانہ مقابلہ کرتے ہوئے جامِ شہادت

نوش کیا

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

فہرست

(از مولانا امین احسن اصلاحی)

جناب مجاہد الحسینی صاحب کی کتاب اسرائیل اور جماعت اسلامی پر ایک سرسری نظر ڈالنے کا مجھے موقع ملا ہے۔ یہ ایک نہایت مفید کتاب ہے جس سے وقت کی ایک نہایت اہم ضرورت پوری ہوئی ہے۔ اس وقت ہمارے ملک میں جمال عبدالناصر کی مخالفت اور اسرائیل کی در پردہ حمایت میں جو بیہودہ پروپیگنڈہ جماعت اسلامی کی طرف سے ہو رہا ہے وہ اس زخم پر نمک پاشی کے حکم میں داخل ہے جو مشرق وسطیٰ کے سانحے سے پوری ملت کو پہنچا ہے لیکن جو بیدرد اور سنگ دل لوگ اس ذلیل کام میں مصروف ہیں وہ اپنی غرض کے ایسے اندھے ہیں کہ مختلف حساس حلقوں کی طرف سے تنبیہہ کے باوجود اپنی اس حرکت سے باز نہیں آئے۔ اس وجہ سے شدید ضرورت اس بات کی تھی کہ اس کا سختی سے محاسبہ کیا جائے اور ان لوگوں کے اغراض مشؤمہ سے پردہ اٹھایا جائے۔ جناب مجاہد الحسینی صاحب نے یہ کتاب

لکھ کر یہی ضرورت پوری کی ہے اور ہمیں ان کا شکر گذار ہونا چاہیئے کہ انہوں نے ایک ایسا فرض ادا کیا ہے جو اس ملک کے ہر غیور اور حساس مسلمان پر عائد ہوتا تھا مشرق وسطے کے حادثہ سے ہر مسلمان کا کلیجہ شق ہوا ہے صرف ایک جماعت اسلامی ہے جس کو اس سے خوشی ہوئی ہے میں یہ بات محض قیاس وگمان کی بنا پر نہیں کہہ رہا ہوں۔ جنگ شروع ہونے سے چند روز پہلے میرے پاس اس جماعت کے ایک معنوی سرپرست تشریف لائے ان کے بستہ میں اخبارات کے کچھ تراشے اور فوٹو تھے وہ ان کی مدد سے مجھے اس بات کا قائل کرنا چاہتے تھے کہ جمال عبدالناصر اسرائیل کا ایجنٹ ہے میں نے ان کے اخباری تراشوں کو کوئی اہمیت نہ دی بلکہ ان کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اب امریکہ اور اسرائیل کے ساتھ جمال عبدالناصر کی دشمنی اس قدر مبرہن ہوچکی ہے کہ ان پر آپ لوگوں کے لئے یہ الزام لگانے کا کوئی جواز باقی نہیں رہا۔ لیکن جب میں نے ان کو اپنی اس رائے پر مصر پایا تو بالآخر یہ عرض کیا کہ بالفرض آپ کا یہ گمان صحیح بھی ہو تو بھی اب آپ کا یہ سارا جمع کردہ مواد بالکل بیکار ہے۔ اوّل تو کوئی اخبار یا رسالہ یہ مواد شائع کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ اور اگر کرے گا تو عوام کے ہاتھوں مار کھائے گا اس پر بڑے گہرے احساس غم کے ساتھ انہوں نے فرمایا کہ :۔

" ہاں اب تو فضا بڑی خراب ہوچکی ہے " ان کے نزدیک فضا کی خرابی یہ تھی کہ جمال عبدالناصر اس وقت پورے عرب بلکہ پورے عالم اسلام کی فضا پر چھا چکے تھے۔ اور عام گمان یہی تھا کہ جنگ چھڑی تو فتح عربوں کی ہوگی۔ اس فضا سے عالم اسلام کا بچہ بچہ خوش تھا اور ظاہر ہے کہ ہر ایک کو خوش ہی ہونا تھا لیکن

یہ حضرات اس نقصان سے سخت سراسیمگی اور پریشانی میں مبتلا ہیں اور اس وقت تک ان کی جان میں جان نہیں آئی۔ جب تک اسرائیل کو فتح اور عرب کو شکست نہیں ہو گئی۔

جمال عبدالناصر کی دشمنی ان حضرات کے رگ و پے میں اس طرح جاری و ساری ہو چکی ہے کہ ان کے خلاف بڑے سے بڑا جھوٹ گھڑنا اور پھیلانا ان کے ہاں نہ صرف ایک کارِ ثواب بلکہ اقامتِ دین کے پروگرام کا ایک جزو بن چکا ہے جن بزرگ کا اوپر میں نے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے کچھ عرصہ ہوا بڑے اہتمام سے ایک مضمون لکھا جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی کہ جمال عبدالناصر اسرائیل کے ایجنٹ ہیں۔ یہ مضمون ایک اُردو رسالہ میں چھاپا گیا، اور پھر جماعتی وسائل و ذرائع سے بڑے وسیع پیمانے پر اس کی اشاعت کی گئی۔ اگرچہ مضمون اپنے مواد استدلال اور اعداد و شمار کے حوالہ جات سے صاف غمازی کر رہا تھا کہ یہ امریکہ و اسرائیل کے پروپیگنڈا آفس میں بیٹھ کر مرتب کیا گیا ہے۔ لیکن اس کو رنگ ایک انٹرویو کا دیا گیا کہ جو اس کو پڑھے وہ اس کو وہ الاؤنس دے کر پڑھے جو عام طور پر ایک انٹرویو کے لئے معروف ہے اور اگر ضرورت پڑے تو اس کی کسی بات کو تعبیر یا رپورٹنگ کی غلطی قرار دے کر اپنے آپ کو اس کی ذمہ داری سے بچایا جا سکے۔ چنانچہ اس ہوشیاری کا تجربہ مجھے خود ہوا۔ ان صاحب نے ملاقات کے وقت مجھ سے اپنے اس مضمون کی بابت بھی سوال کیا کہ تمہاری اس کے بارے میں کیا رائے ہے؟ میں نے پہلے تو اس ہوشیاری کی طرف اشارہ کیا جو ایک مضمون کو انٹرویو کی شکل دے کر کی گئی تھی۔ پھر اس بے تحاشا جھوٹ کا حوالہ دیا۔

جس سے یہ پورا مضمون مملو تھا۔

انہوں نے پہلی بات کا تو ایک قسم کے احساس خفت کے ساتھ جواب دینے کی کوشش کی لیکن دوسری بات کی ذمہ داری انہوں نے میری توقع کے مطابق غلط تعبیر اور غلط رپورٹنگ ہی پر ڈالی۔ مثلاً انہوں نے کہا کہ میں نے انٹرویو میں یہ کہا تھا کہ "جمال عبدالناصر نے کم از کم پچاس ہزار اخوان کو جیل میں ڈالا" لیکن رپورٹنگ میں یہ بات یوں آئی کہ "پچاس ہزار اخوان کو قتل کیا"۔ اسی طرح ایک اور پہاڑ کے برابر کی جھوٹ کی ذمہ داری بھی موصوف نے غلط رپورٹنگ ہی پر ڈالی۔ اس پر میں نے عرض کی، پھر آپ نے اس کی تصحیح کیوں نہ فرمائی کہ آپ سے حسن ظن رکھنے والوں کو آپ کے باب میں کوئی سوءِ ظن نہ پیدا ہوتا۔ اس کا جواب موصوف نے یہ مرحمت فرمایا کہ "میں نے اس کی تصحیح بھیجی تھی لیکن" ان لوگوں" نے وہ شائع نہیں کی۔ "ان لوگوں" سے موصوف کا اشارہ جماعت کے حل وعقد کی طرف تھا یا رسالہ کے کار پردازوں کی طرف! اس کا فیصلہ میں نہیں کر سکا۔ البتہ میں نے یہ سوچا کہ جب ایک مکھی کو بھینس بنا کر اس سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے تو آخر یہ حضرات تردید و تصحیح کی کھکیڑ میں کیوں پڑتے ؟

اس طرح کا ایک اور جھوٹ اس جماعت کے ایک رکن نے جو شاہ فیصل کے رابطہ اسلامیہ سے تنخواہ پاتے ہیں، جماعتی اخبارات میں پھیلایا کہ اب کے سال حج کے موقع پر جمال عبدالناصر نے یمنیوں کو اس سازش کے ساتھ بھیجا تھا کہ وہ (نعوذ باللہ) بیت اللہ کو بم سے اڑا دیں۔

جنگ کے بعد خیال تھا کہ یہ بیہودہ پروپیگنڈا بند ہو جائے گا۔ لیکن افسوس

ہے کہ نہ صرف یہ کہ یہ بند نہیں ہوا بلکہ اس نے پہلے سے بھی زیادہ شدت و وسعت اختیار کرلی۔ اور اب اس میں ناصر کی دشمنی کے ساتھ ساتھ اسرائیل کی دوستی و حمایت کا رنگ بھی نمایاں ہورہا ہے۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ اس جنگ سے اسرائیل اور امریکہ کا جو اصل مقصد تھا، یعنی جمال عبدالناصر کو اقتدار سے ہٹانا، وہ پورا نہ ہو سکا، بلکہ شکست کے باوجود ناصر صاحب کا اقتدار پہلے سے زیادہ مستحکم ہوگیا ہے۔ اس خلافِ توقع ردِّ عمل نے اسرائیل اور امریکہ کے ان کارپردازوں کو بالکل بوکھلا دیا ہے۔ اور انہوں نے شکست اور اسباب شکست کے پردے میں ایسی ایسی باتیں پھیلانی شروع کردی ہیں جن سے ناصر دشمنی کا مقصد بھی پورا ہورہا ہے۔ اور اسرائیل و امریکہ کا حق نمک بھی ادا ہو رہا ہے۔

اسباب فتح و شکست کے تجزیے سے ان حضرات نے جو نکتے حاصل کئے ہیں ان میں سے دو نکتوں کو خاص طور پر ان کے اخبارات و رسائل اور ان کے مقررین و محررین پھیلا رہے ہیں ایک تو یہ کہ اسرائیل کو جو فتح حاصل ہوئی اس کی وجہ یہ ہے کہ اسرائیلی موسیٰ، اسحٰق، یعقوب، ابراہیم علیہم السلام جیسے جلیل القدر پیغمبروں کے نام لیتے ہیں۔ عبادت خانوں میں حاضری دیتے ہیں، توراۃ اور تالمود کی تلاوت کرتے ہیں۔ دعا اور استغفار کرتے ہیں، وغیرہ وغیرہ ـــ برعکس اس کے جمال عبدالناصر بے دین اور ملحد ہے وہ قرآن کو فرعون کے مجسمہ کے نیچے دفن کرتا ہے۔ اپنے آپ کو فرعون کی طرف منسوب کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ناصر عرب قومیت کا داعی ہے اور قومیت کا نعرہ ایک جاہلی نعرہ ہے جس کے لئے شکست ہی مقدر ہے

جہاں تک اسرائیل کے تقویٰ اور تدین کا تعلق ہے اس کی شاہد اگر کوئی جماعت خدا کی زمین پر آج ہے تو وہ صرف جماعت اسلامی ہے جماعت اسلامی کے سوا نہ کسی نے پہلے یہ شہادت دینے کی جرأت کی نہ آج یہ شہادت دینے کی کوئی جرأت کر سکتا۔ خدا، رسول اس کے فرشتوں اور اس کے نبیوں کی شہادت، جو قرآن اور تورات دونوں میں موجود ہے، وہ تو یہ ہے کہ آسمان کے نیچے اس قوم سے زیادہ خدا کی نافرمان اور باغی قوم کوئی نہیں ہے چنانچہ اسی وجہ سے اس قوم پر لعنت ہوئی اور جس زمانے میں یہ لعنت ہوئی قرآن میں تصریح ہے کہ اس زمانے میں بھی یہ موسیٰؑ اور ابراہیمؑ پر فخر اور تورات وتالمود کی تلاوت کرتی تھی۔ ایمانی واخلاقی اعتبار سے اس زمانے کے مقابل میں آج اس قوم نے نہ صرف یہ کہ کوئی ترقی نہیں کی ہے، بلکہ اس کی کوئی رمق باقی تھی تو وہ بھی ختم ہو چکی ہے چنانچہ آج اس زمین پر کوئی قوم بھی سود خوری بے حیائی زناکاری، جھوٹ سازش مکاری اور بے ایمانی میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی خود دہی بزرگ جن کا اوپر حوالہ گذرا، میرے سامنے اپنا عینی مشاہدہ بیان کر کے گئے ہیں کہ یہود کے کسی محلہ کی نمایاں علامت یہ ہے کہ اس میں مرد و زن کے آزادانہ اختلاط کے مظاہرے آپ کو ہر قدم پر نظر آئیں گے۔ ایسے حالات میں جو لوگ یہود کے تقویٰ و تدین کی شہادت دے رہے ہیں ان کی یہ شہادت یا تو بے غیرتی کی دلیل ہے یا سادہ لوحی کی اور یہ دونوں چیزیں یکساں قابل ماتم ہیں —— اگر کہا جا سکتا ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسرائیل نے اس عرصے میں اپنے آپ کو ایک محنتی اور جفاکش قوم بنا لیا اور امریکہ و برطانیہ کی امداد

سے اسے جو کچھ حاصل ہوا، اس سے اس نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ برعکس اس کے عرب نہ ملّت باقی رہے، نہ قوم بن سکے اور اپنے وسائل و ذرائع کو انہوں نے قومی مقاصد کے بجائے اپنی تن آسانیوں اور راحت کوشیوں پر صرف کیا، جس کا خمیازہ ان کو بھگتنا پڑا۔

قومیّت کے نعرے کو جو اس شدومد سے مطعون کیا جا رہا ہے، یہ بھی ایک مہمل بات ہے۔ قطع نظر اس سے کہ قومیّت کا نعرہ غلط چیز ہے یا صحیح سوال یہ ہے کہ اس جنگ میں اس نعرے سے عرب کو کیا نقصان پہنچا؟ ہر شخص کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے کہ عرب اگر فی الواقع ایک قوم بن گئے ہوتے تو وہ اپنی متحدہ قوت سے اسرائیل کا کچومر نکال دیتے، اور اب بھی ان کے مسئلہ کا کوئی حل ہے تو یہی ہے کہ وہ ایک قوم بنیں اور سخت جان و سخت کوش قوم بنیں، جیسے کہ وہ فی الواقع کبھی تھے اس کے بغیر وہ اپنی آزادی کا تحفظ نہیں کر سکتے، اس قسم کی دفاعی قومیّت ہرگز ہرگز اسلامی وحدت و جمعیت کے منافی نہیں ہے۔ عرب، عرب بھی ہیں اور اسلامی دولت متحدہ کے ایک اہم جزو بھی۔ ان کو ان دونوں ہی چیزوں کے تقاضے پورے کرنے ہیں اور انہی کو نہیں بلکہ ہر مسلمان قوم کو ان دونوں کے تقاضے پورے کرنے ہیں —— ہمارے الگ الگ قوم ہونے کے معنی یہ نہیں کہ ہم ملّت اسلامیہ کے اجزاء نہیں رہے۔ اسلامیت کا رشتہ قومیّت کے رشتہ سے بالاتر ہے ہم اپنے ملکوں اور وطنوں کے اعتبار سے الگ الگ بھی ہیں اور اسلام کے اعتبار سے متحد بھی —— آخر اس جنگ میں ہر شخص نے دیکھا کہ حملہ اگرچہ مصر پر ہوا تھا،

جس کے صدر اپنے نعرۂ قومیت کی بناء پر مطعون کئے جاتے ہیں، لیکن مراکش اور تیونس سے لیکر پاکستان و افغانستان تک ہر ملک نے اس حملہ کو اپنے اُوپر محسوس کیا۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگر یہ جنگ حادثۃً پر تمام نہ ہو گئی ہوتی بلکہ طول کھینچتی تو تمام مسلمان ملکوں کی فوجیں اس میں شانہ بشانہ لڑتیں کوئی بھی اس کو صرف عرب کی جنگ کہکر اس سے اپنے کو الگ رکھنے کا ننگ گوارا نہ کرتا۔

دراصل نہ قومیت کا نعرہ کوئی منتر ہے، نہ خالی خولی رابطہ اسلامیہ کا نعرہ کوئی جادو کی چھڑی۔ یہ دُنیا عالم اسباب ہے اس میں صرف نعرے کام نہیں دیتے، آپ اسلام اور اسلامی وحدت کا نعرہ لگائیں۔ لیکن نہ آپ کے پاس فوج ہو، نہ ٹینک، نہ ہوائی جہاز، نہ میزائیل، تو اسرائیل کیا، کسی سے بھی مار کھا سکتے ہیں، کوئی تن آسان اور بے ہنر قوم مزار کے مجاوروں کی سی فوج کے ساتھ کبھی بھی دنیا میں اپنی آزادی باقی نہیں رکھ سکتی اسی طرح کوئی قومیت کا نعرہ لگائے لیکن ایک قوم جن صفات و اوصاف سے مرکب ہوتی ہے وہ قوم میں نہ پیدا ہوں تو اس کے سارے ٹینک اور ہوائی جہاز دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ اور وہ اپنے سے بدرجہا چھوٹی فوج سے شکست کھا جاتی ہے۔

ہمارے نزدیک جمال عبدالناصر نہ فرشتہ ہیں، نہ شیطان، وہ اسی طرح کے ایک مسلمان حکمران ہیں جس طرح کے ہمارے دوسرے مسلمان حکمران ہیں ان سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں اور انہوں نے کارنامے بھی انجام دیئے ہیں۔ اخلاف

کے معاملے میں ممکن ہے ان سے بعض زیادتیاں بھی ہوئی ہوں۔ لیکن اس چیز کو بہانہ بنا کر ان کی دشمنی کو دین بنا لینا اور ان کی شکست پر جو پوری ملت کی شکست ہے "اسرائیل کی طرح خوشیاں منانا، اخوان دوستی سے زیادہ اسرائیل دوستی کی دلیل ہے جس کا ارتکاب کوئی غیرت مند مسلمان نہیں کر سکتا۔ اس وجہ سے ان کے خلاف پروپیگنڈا کرنے والوں کو ہم یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اس شریفانہ مشغلہ سے باز آئیں، یہ جمال عبدالناصر کے لئے شاید اتنا مضر نہ ہو جتنا آئندہ خود ان کے لئے ہو سکتا ہے۔ دوسروں کا آلۂ کار بن کر ملت دشمنی کا کاروبار کبھی کسی کو راس نہیں آیا ہے۔

ایک قوم کی حیثیت سے بھی ہمارے سیاسی اخلاق کا تقاضا ہے کہ اس طرح کی چھچھوری حرکتوں سے ہمارے ہم قوم احتراز کریں۔ پچھلے واقعات نے آفتاب کی طرح یہ حقیقت روشن کر دی ہے کہ جمال عبدالناصر نہ صرف اپنی قوم کے بلکہ عالم اسلامی کے ایک بہت بڑے حصہ کے محبوب لیڈر ہیں۔ شاید ہی دنیا کا کوئی لیڈر اتنی خوفناک شکست کھانے کے بعد اپنی محبوبیت کو اس طرح قائم رکھ سکا ہو۔ جس طرح انہوں نے قائم رکھی۔ اس کی وجہ ان کے کردار کی وہ بلندی ہے جس کا اظہار انہوں نے شکست کھانے کے بعد کیا کہ شکست کی ساری ذمہ داری انہوں نے اپنے اوپر اوڑھ لی اور اپنے آپ کو ایک مجرم کی حیثیت سے اپنی قوم کے سامنے پیش کر دیا۔ ایسے بلند کردار لیڈر روز روز نہیں پیدا ہوتے۔ ان کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کے بجائے ہمیں ان کے لئے دعا کرنی چاہئے۔ کہ خدا انہیں اس شکست سے صحیح سبق حاصل کرنے کی

توفیق دے۔ ان کے عزم کو قائم و دائم رکھے، ان کو اپنے دین کی راہ سجھائے
اپنی غلطیوں پر انہیں توبہ کی توفیق بخشے اور ان کے اندر صلاح الدین ایوبی
کی روح پیدا کرے۔

امین احسن اصلاحی
۲۷ جولائی ۱۹۶۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ گفتنی

مشرقِ وسطیٰ میں اینگلو امریکی گٹھ جوڑ اور رُوس کی مصلحت آمیز پالیسی کے باعث دنیائے عرب کو جن ہولناک اور جانگداز حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ محتاجِ وضاحت نہیں ہے!

عرب دُنیا کے عین وسط میں جس دودھاری خنجر (اسرائیل) کو امریکہ برطانیہ اور دیگر استعماری طاقتیں خوب خوب تیز کر رہی تھیں اس کی ہلاکت خیزیوں سے عالمِ اسلام کا وجود بالآخر چھلنی ہو کر رہا۔ اور دُنیا کے حریت پسندوں کی طرف سے استعماری قوتوں کی سازش گاہ "اسرائیل" کے خطرناک عزائم کی جو نشاندہی کی جا رہی تھی وہ بالکل درست ثابت ہوئی:

آج اسرائیل کی بربریت و بہیمیت کا صرف عرب ممالک ہی شکار نہیں ہوئے ہیں بلکہ پوری دنیا کے حریت پسند عوام اور فرزندانِ توحید ان غارت گرانِ مغرب کی جفاکیشیوں اور ستمرانیوں سے براہِ راست

زخمی ہوئے ہیں۔

اسرائیلی جارحیت کے اسباب کیا ہیں۔ اس کا پس منظر اور پیش منظر کیا ہے؟ اور عربوں کی آزادی سلب کرنے اور دنیائے اسلام کو ذلیل و رسوا کرنے کے لئے سامراجی طاقتوں نے کیا کیا خطرناک منصوبے بنائے ہیں۔ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے چند بنیادی باتیں ذہن نشین کرلی جائیں تاکہ دنیا میں رُونما ہونے والے واقعات کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کی جا سکے۔

مشرق وسطےٰ کے بحران کا تفصیلی جائزہ لینے سے پہلے ضروری ہے کہ دُنیائے اسلام کی صُورتِ حال پیش نگاہ رکھیں۔

آپ دُنیا کے کسی بھی اسلامی ملک کے حالات دیکھئے۔ تو یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آئے گی۔ کہ یہ تمام ملک ضرور کسی نہ کسی انقلاب کا شکار رہے ہیں۔ ترکی کی خلافت عثمانیہ کے زوال اور خطۂ عرب کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کرنے سے لے کر آج تک یہ اسلامی ممالک سامراجی طاقتوں کی مکروہ چالوں اور گھناؤنی سازشوں کا مرکز رہے ہیں کسی برسر اقتدار پارٹی نے ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے میں اگر ذرہ برابر بھی ہچکچاہٹ سے کام لیا تو اس کی حکومت کا تختہ الٹ کر اپنے مفید مطلب افراد کو تخت اقتدار پر متمکن کرادیا گیا۔ لیکن ان پے درپے اور متواتر انقلابات نے جہاں ان ممالک کے لئے بہت سی مشکلات پیدا کیں وہاں یہ فائدہ بھی ہوا کہ اس شکست و ریخت میں عوام کا شعور بیدار ہوگیا۔ اور جمہور

کو آدابِ حکمرانی سے آگاہی حاصل ہو گئی۔

ایران میں ڈاکٹر مصدق کی وزارت کا تختہ اُلٹنے کا مرحلہ ہو یا ترکی کے عدنان مندریس اور اس کی جماعت کے اراکین کو پھانسی پر لٹکا دینے کا سانحہ، نائیجیریا میں سرابوبجر اور احمد وبیلو کو شہید کرنے کی سازش ہو یا انڈونیشیا میں ڈاکٹر عبدالرحیم سکارنو کا اقتدار ختم کرنے اور وہاں کے لاکھوں مسلمانوں اور جلیل القدر علماء کرام کو کمیونسٹ قرار دے کر گولی کا نشانہ بنا دینے کا حادثہ یا پاکستان پر بھارت کا جارحانہ حملہ

الغرض مختلف اسلامی ممالک (الجزائر۔ نائیجیریا۔ ملائشیا سوڈان یمن ۔مصر۔ عراق۔ پاکستان وغیرہ) میں روزمرہ جو بحران پیدا ہوتا رہا ہے اس میں کسی نہ کسی طرح ضرور ان سامراجی قوتوں کا اشارہ ابرُو اور دستِ غیب کارفرما رہا ہے۔ اور ان کی انتہائی کوشش یہ رہی ہے کہ مسلم ممالک کے سربراہوں کو رسوائے زمانہ انگریزی ڈپلومیسی لڑاؤ اور حکومت کرو (DEVIDE AND RULE) کے مطابق باہمہ گر دست و گریباں کیا جائے اور انہیں سبز باغ دکھا کر ایسے ایسے دور دراز کار مسئلوں میں الجھا دیا جائے کہ وہ اپنے قومی اور ملکی ذرائع آمدن ملکی اور ملی تعمیر و ترقی پر خرچ کرنے کی بجائے اپنا قیمتی وقت ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور سامراجیوں کے ناپاک مقاصد کی تکمیل میں صرف کرتے رہیں۔

اختلافِ باہمی

ذرا غور فرمایئے! کہ عربوں کی آزادی سلب کرنے اور ان کے سینے میں خنجر پیوست کرنے کے لئے سامراجیوں نے ایک طرف تو اسرائیل کو جنم دیا۔ اور دوسری طرف ان کے لئے یمن کے مسئلہ کو اس قدر گھناؤنی صورت میں پیش کر دیا گیا۔ کہ وہ اسی میں بُری طرح اُلجھ کے رہ گئے۔ اور نوبت بایں جا رسید کہ سعودی عرب اور مصر دونوں کی فوجی طاقت یہودی ریاست اسرائیل کے مقابلے میں صرف ہونے کے بجائے ... اپنے ہی خلاف صرف ہونے لگی۔

سوال یہ ہے کہ اگر اہل یمن نے سابق حکمران امام احمد کے ظلم و تشدد اور اس کی ملوکانہ ستمرانیوں سے نجات حاصل کی تھی تو یہ کس شریعت کی رُو سے ضروری تھا کہ حکومت و اقتدار کے تمام وسائل دوبارہ اس کے فرزند ارجمند امام بدر کے حوالے کر دیئے جائیں۔

یمن کے عوام نے شدّت کے ساتھ محسوس کیا کہ اگر باپ کے بعد ولی عہد امام بدر برسرِ اقتدار آجاتا ہے تو یہ بھی اپنے باپ کی طرح بادشاہ بن کر ملک کے تمام وسائل و ذرائع ملک و ملت پر صرف کرنے کی بجائے اپنے ذاتی تصرف میں لائے گا، اس لئے بہتر ہے کہ ملوکیت کے خاتمہ کے بعد جمہوری دور کا آغاز کیا جائے۔

یمن سے ملوکیت کے خاتمے پر سامراجی قوتوں نے ہمسایہ حکمران کے کان میں یہ بات ڈالی۔ کہ اگر آج یمن سے ملوکیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے تو اس کا اثر لازماً تم پر بھی پڑے گا۔ اور یہاں بھی شہنشاہیت کے خلاف

ویسی ہی تحریک اُٹھے گی۔ اس لئے ضروری ہے کہ امام بدر کی بحالی کے
لئے اپنے تمام وسایل و ذرائع بروئے کار لائے جائیں۔ سامراجیوں کو
اس تحریک کے در پردہ عدن کی آزادی کا مسئلہ بھی دکھائی دے رہا تھا
جہاں حریت پسندوں نے برطانوی استبداد کے خلاف جہاد آزادی
شروع کر رکھا ہے۔ انہوں نے سوچا کہ اگر یمن کی آزادی کا اثر سعودی
عرب پر پڑ سکتا ہے۔ تو پھر عدن سے برطانوی اثر و اقتدار کا سورج بھی غروب
ہو کر رہے گا۔ اس لئے برطانیہ کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ شاہ سعود
یمن کے امام بدر کی بحالی پر ہی اپنی ساری طاقت مصروف رکھیں۔ نیز
سامراجیوں کو قضیۂ یمن سے دوسرا بڑا فائدہ یہ پہنچ رہا تھا۔ کہ مشرق وسطیٰ
میں تحریک آزادی کے علمبردار اور اتحاد عرب کے داعی جمال عبدالناصر
جس نے ۱۹۵۶ء میں برطانیہ، فرانس اور اسرائیل کے مشترکہ فوجی
حملہ کو ناکام بنا دیا تھا۔ اور جو دوسرے خطہ عرب سے ان سامراجیوں
کو نکال باہر کرنے کی زبردست مہم جاری کر چکا تھا۔ وہ مسئلہ یمن
میں الیسا الجھا رہے گا۔ کہ اسے مقصد حقیقی کے حصول میں سخت
دشواریاں پیش آئیں۔ اور یہ مسئلہ اس کے بلند عزائم کے سامنے کوہ گراں
بنا رہے گا۔ ان معروضات کو ملحوظ رکھ کر ذرا غور فرمائیے کہ اسلام
اور مسلمانوں کی ان دشمن طاقتوں نے مسلمانوں کے درمیان کس طرح
نفاق کے بیج بوئے اور وہ ایک دوسرے سے اس درجہ متنفر ہو گئے کہ
اسرائیل کے حملہ سے ایک دو روز قبل اُردن اور شام کی فوجوں

میں شدید جھڑپ ہو گئی۔ جس کے نتیجہ میں کئی قیمتی جانیں ضائع ہوئیں
ایک طرف تو ان سامراجی طاقتوں نے مسلمانوں کو آپس میں برسرِ پیکار
رکھا اور دوسری طرف اسرائیل کو جدید ترین جنگی ساز و سامان اور مہلک
ترین ہتھیاروں سے کر خوب مضبوط سے مضبوط تر اور مستحکم سے مستحکم بنا دیا
بالخصوص ایٹمی ری ایکٹر اور ناقابل تسخیر فضائی تحفظ کا سامان فراہم کر
کے یہودی بھیڑیوں کو اس قدر مضبوط کر دیا گیا کہ وہ کسی بڑی سے
بڑی طاقت کو خاطر میں لانے پہ آمادہ نہ ہو سکتے تھے۔

مصالحانہ کوشش

یہ خبر بڑی حوصلہ افزا اور اطمینان بخش
ہے کہ صدر ناصر اور شاہ فیصل کے درمیان مسئلہ یمن پر جو باہمی کشمکش اور اختلاف
پایا جاتا ہے۔ دونوں سربراہان مملکت اسے ختم کر کے مصالحت پر آمادہ ہو گئے
ہیں۔ اس سلسلہ میں سوڈان کے صدر اسمٰعیل الازہری اور عراق کے صدر عارف نے
اہم خدمات سرانجام دے دیے ہیں۔

نیز خرطوم میں عرب وزراء خارجہ کی کانفرنس میں بھی یہ تجویز پیش کی گئی
ہے۔ کہ دونوں ملک اگست ۱۹۶۵ء کے معاہدہ جدہ کی بنیاد پر مسئلہ یمن حل
کر لیں۔ اس معاہدہ میں یہ طے پایا تھا کہ دونوں ملک یمن سے اپنی اپنی فوجیں
واپس بلا لیں۔ اس کے بعد یمن میں آزادانہ رائے شماری کرائی جائے اور
یمنی عوام کو پورا پورا حق دیا جائے کہ صدر عبداللہ السلال کی جمہوری حکومت
برقرار رکھیں یا امام البدر کی بادشاہت قبول کر لیں۔ اس معاہدہ میں یہ بھی طے

پایا تھا کہ یمن کے عوام کو اپنے مستقبل کا تعین کرنے کا موقع دینے کے لئے ضروری ہے کہ ایک عبوری حکومت بنائی جائے جس میں صدر سلال اور امام بدر دونوں کے نمائندے شامل ہوں گے۔

یہ ایک نہایت ہی معقول تجویز تھی جسے ناقابل عمل بنانے کے لئے غیروں کے علاوہ اپنوں نے بھی نہایت مکروہ کردار ادا کیا ہے اور اختلافات کو ہوا دینے کی کوشش کی ہے۔

آج — جب کہ دو مسلمان سربراہان مملکت کے درمیان مصالحت کی از سر نو کوششیں کی جا رہی ہیں۔ حالیہ اسرائیلی جارحیت اور سامراجیوں کے خطرناک عزائم کو ہرگز ہرگز نظر انداز نہ کرنا چاہیئے اور صورت حال کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے۔ مصلحت کے تقاضے پورے کرنے کے لئے اختلاف و انتشار کی فضائی الفور ختم کر دینی چاہیئے اور اپنے اسلامی رشتہ اخوت و مودت کو مضبوط تر کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ تاکہ پوری یکسوئی، یکجہتی کے ساتھ دشمنان اسلام کا مقابلہ کیا جا سکے۔

اگر ہم اس پس منظر کو سامنے رکھ کر مشرق وسطیٰ کے حالیہ بحران اور اسرائیلی جارحیت کے اسباب و محرکات پر غور کریں۔ تو صورت حال کو صحیح خدوخال کے ساتھ دیکھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آسکتی جیز ہمیں اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ امریکہ اور برطانیہ کی شہہ پر اسرائیل کے ظالمانہ حملے کی نوعیت کیا تھی؟ اور ان کا باہم دگر فوجی قوت کا تناسب کیا تھا۔ یہ عنوان درحقیقت

نفس مسئلہ کو الجھانے اور حقیقی دشمنوں سے عوام کی توجہ ہٹانے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

ہماری نگاہ درا صل اس مسئلہ پر مرکوز رہنی چاہیئے کہ اسرائیل کے نام پر یہودی ریاست کس نے قائم کی اور کون اس کے استحکام و استقلال کی سر توڑ کوشش کر رہا ہے۔

یہودی ریاست کا قیام

تاریخی پس منظر

دو ہزار سال سے بھی زیادہ عرصہ کے بعد یہودی ریاست اسرائیل کا نئے سرے سے قیام عصر حاضر کا ایک ایسا المناک حادثہ ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہودی پوری دنیا میں راندۂ درگاہ اور مغضوب قوم تھی۔ روس، امریکہ، جرمنی اور دوسرے کئی ممالک ان خطرناک لوگوں کو اپنے ہاں قدم رکھنے کی اجازت دینے کو آمادہ نہ تھے۔ بلکہ اس محدود اقلیت کو صفحہ ہستی سے مٹانے کیلئے تمام مغربی ملکوں نے اپنے اپنے مفادات کے پیش منظر یہودیوں کے خلاف محاذ قائم کر لیا اور انہیں زندگی کی عام سہولتوں سے بھی محروم کرنے کی تدبیریں کی جانے لگیں۔ یہودی اس صورت حال سے پریشان ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے عام زندگی میں کچھ مناسب تبدیلیاں پیدا کیں اور اپنے سیاسی نظریات کو کچھ اس سلیقے سے پیش کیا۔ کہ سامراجی ملکوں نے ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور نہ صرف ان کی مخالفت سے ہاتھ اٹھا لیا گیا۔ بلکہ اس مغضوب و مردود قوم کو ہر طرح کے سماجی و سیاسی تحفظات دینے پر آمادگی ظاہر

کردی اور اس طرح اسرائیل کی متعفن لاش میں زندگی کے آثار نمودار ہونے لگے۔

اب مغربی ملکوں نے یہودیوں کو اجتماعی آزادی عطا کرنے کا اس شرط پر فیصلہ کیا کہ وہ امن و سکون کے ساتھ رہیں گے اور کسی دوسرے کی آزادی کو خطرہ لاحق نہ ہونے دیں گے۔ ابھی اس فیصلہ کی سیاہی خشک نہ ہو پائی تھی کہ یہودیوں کی عقربی ذہنیت عود کر آئی اور انہوں نے کچھ ایسی حرکتیں شروع کر دیں جس کے باعث اِن کے مربی ممالک خبردار ہو گئے۔ اور یہودیوں نے بھی سیاسی خطرہ محسوس کرتے ہوئے انہوں نے یہودیوں کی حمایت سے نہ صرف دست کشی اختیار کی بلکہ ان کو نیست و نابود کرنے کا زبردست پروگرام بنایا گیا۔ اس مرتبہ دینی عصبیت کی جگہ سیاسی تعصب کارفرما تھا۔ انیسویں صدی کے آخر تک تقریباً یہی حالت قائم رہی۔ یہودیوں کی مخالف تحریک کو اس وقت "L" ANT SEMITIONE یعنی مخالف سامی تحریک کہا جاتا ہے۔

امریکی صدر کی یہود دشمنی

اس وقت یہودیوں کی مخالفت میں امریکہ پیش پیش تھا۔ چنانچہ ۱۷۸۹ء میں جب امریکہ کا دستور وضع کیا گیا۔ تو امریکی صدر بنجامین فرنیکلن نے اپنی ایک تقریر میں یہودیوں کو رگیدتے ہوئے، اعلان کیا کہ "امریکہ کی متحدہ ریاستوں کو ایک زبردست خطرہ درپیش ہے۔ یہ خطرہ یہودیوں کا ہے۔ جس سرزمین میں

یہودی آباد ہوئے ہیں۔ انہوں نے اس کی اخلاقی سطح کو پست اور تجارتی دیانت کو کم کر دیا ہے۔ انہوں نے اپنا وجود ہمیشہ برقرار رکھا ہے۔ اور دوسری قوموں کے اندر اپنے آپ کو جذب ہونے سے بچایا ہے۔ اگرچہ وہ اس کے نتیجہ میں جبر و تشدد کا شکار بھی ہوئے۔ یہ لوگ قوموں کا مالی لحاظ سے گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ پرتگال اور سپین کی مثالیں واضح ہیں، ۱۷۰۰ سال سے زائد عرصہ ہو رہا ہے۔ یہ اپنی بدنصیبی پر نوحہ کناں رہے ہیں کہ انہیں اپنے وطن سے نکال دیا گیا ہے۔ لیکن معزز حضرات اگر دنیا آج فلسطین ان کی جائداد قرار دیکر انہیں واپس بھی دے دے تو اس کے فوراً بعد یہ وہاں نہ جانے کے حیلے بہانے تراشنے لگیں گے — کیوں —؟ یہ خونخوار بھوت ہیں یہ آپس میں مل کر نہیں رہ سکتے۔ یہ تو عیسائیوں اور ان دوسرے لوگوں کے درمیان رہیں گے۔ جن کا ان کی نسل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اگر انہیں دستور کے ذریعہ امریکہ سے نہ نکالا گیا تو سو برس کے اندر اندر اس ملک میں اتنی بڑی تعداد میں سیلاب کی صورت میں اُمڈ پڑیں گے کہ وہ ہم پر حکمرانی کریں گے ہمیں تباہ کر دیں گے۔ ہماری حکومت کی ہیئت کو تبدیل کر دیں گے۔ جس کے لئے ہم امریکیوں نے خون بہایا ہے۔ اپنی جان، اپنے مال اور اپنی شخصی آزادی قربان کی تھی۔ اگر یہودیوں کو اس سرزمین سے دو سو برس کے اندر اندر نہ نکالا گیا تو ہمارے بچے ان کے پیٹ بھرنے کے لئے کھیتوں میں کام کرتے ہوں گے اور

یہ خود روپیہ گننے اور رنگ رلیاں منانے میں محو ہوں گے!

معزز حضرات! میں آپ کو متنبہ کرتا ہوں کہ اگر آپ نے یہودیوں کو یہاں سے ہمیشہ کے لئے نہ نکالا تو آپ کے بچے اور ان کی اولاد آپ کی قبروں پر لعنت بھیجیں گے۔ یہ چاہے ہم میں وہ پشتوں تک رہیں امریکیوں کے تصورات سے کبھی ہم آہنگ نہ ہوں گے۔ یہ ہمارے دستور و قوانین کو خطرہ میں ڈال دیں گے۔ انہیں بہر حال دستور کے ذریعہ امریکہ سے نکال باہر کرنا چاہتے ہیں" (فرینکلن)

فلسطین کی مرکزیت

یہودیوں کے وجود سے امریکہ ہی نے خطرہ محسوس نہیں کیا تھا۔ جرمن اور روس وغیرہ ممالک کے باشندوں کی پالیسی ان سے کہیں زیادہ سخت تھی! ہر ملک کا فیصلہ یہی تھا کہ "یہودی" کا وجود ناقابل برداشت ہے۔! ہٹلر کے زمانہ میں "یہودی نسل کشی" کے سخت گیرانہ اقدامات اسی سلسلہ کی مربوط کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں

مغربی ملکوں کے تشدد اور یہودی نسل کشی پالیسی سے تنگ آکر "یہودی" بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ انہیں دنیا بھر میں مارا مارا پھرنے کی بجائے اپنا الگ وطن بنانا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے جب اس نظریہ کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ تو یورپ نے سمجھا کہ اس طرح ایک بلا آسانی کے ساتھ ٹل سکتی ہے۔ چنانچہ ابتداً انہیں افریقہ کے علاقہ تنزانیہ کی پیشکش کی گئی۔ یہودی لیڈروں نے اس بے آب وگیاہ علاقہ کو اپنا روحانی مرکز نہ ہونے کے

باعث اس پیشکش کو ٹھکرا دیا اور اس کی بجائے فلسطین کو اپنا وطن قرار دینے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ اس مقدس سرزمین کی یاد انہیں ہر زمانے میں بے چین رکھتی تھی۔

فلسطین کو مرکز قرار دینے کا محرک آسٹریلیا کا ایک روشن خیال یہودی اخبار نویس تھا جس کا نام ڈاکٹر تھیوڈر ہرٹسل تھا۔ اس نے اپنی تحریک کا آغاز اس وقت کیا جب روس اور فرانس میں یہودیوں پر عرصہ حیات تنگ کیا جا رہا تھا۔ اس نے ۱۸۹۶ء میں ایک کتاب "یہودیوں سلطنت" کے نام سے شائع کی جسمیں یہ نظریہ پیش کیا گیا کہ یہودی مسئلہ کا واحد حل یہی ہے کہ انہیں الگ ایک ملک میں جمع کیا جائے اور تمام سلطنتیں ان کا وجود تسلیم کر لیں۔

دنیا بھر کے یہودیوں نے اس تحریک کو پسند کرتے ہوئے نہایت گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا اور اسے کامیاب بنانے کے لئے ۱۸۹۷ء میں شہر بال میں اپنی پہلی کانفرنس منعقد کی جس میں مختلف ملکوں کے دو سو یہودی نمائندے شریک ہوئے!

"بال کانفرنس" نے قومی وطن کے قیام کی تحریک منظور کر لی اور اسے یہودیوں کی قومی تحریک بنا دیا اور اُس کا نام "صیہونی تحریک" قرار پایا صیہون ایک پہاڑ کا نام ہے جس کی بابت تورات میں لکھا ہے کہ بیت المقدس اسی پر تعمیر ہوا تھا اور اس کے لئے ایک یہ قابل عمل پروگرام تیار کیا گیا۔

فلسطین میں یہودیوں کے لئے قومی وطن پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ بین الاقوامی قانون اس کی حمایت کرے اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے یہ وسائل اختیار کئے جائیں۔

۱۔ یہودی کاشت کاروں اور دستکاروں کو فلسطین کی طرف رُخ کرنے پر آمادہ کیا جائے۔

۲۔ مقامی اور بین الاقوامی انجمنوں کے ذریعہ یہودیوں کی شیرازہ بندی کی جائے۔

۳۔ پوری قوم میں یہودی قومیت کا جذبہ جگایا جائے۔

۴۔ عثمانی حکومت کو یہودی وطن کی تجویز قبول کر لینے پر آمادہ کیا جائے۔

عملی جدوجہد کا آغاز

اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وائنا میں مرکزی انجمن قائم کی گئی اور ڈاکٹر ہرٹسل نے اس جدوجہد کی قیادت سنبھالی۔ اُس نے ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۲ء تک سلطان عبد الحمید سے کئی ملاقاتیں کیں اور انہیں بھاری مقدار قوم کی پیش کش کر کے اس سے فلسطین کا علاقہ حاصل کرنے کی کوشش کی مگر وہ اسے قبول کرنے کو تیار نہ ہوئے سلطان کے برابر انکار سے جب پوری طرح مایوس اور نا اُمید ہو گئے تو ڈاکٹر ہرٹسل نے برطانیہ سے اپنی گفتگو کا سلسلہ قائم کیا اور برطانوی مدبروں سے اپنی ملاقاتوں میں ڈاکٹر ہرٹسل نے جزیرہ نمائے سینا میں یہودی نوآبادی قائم کرنے کی اجازت چاہی۔ برطانوی مدبر چونکہ یہودیوں کے وجود

سے خالف تھے۔ اور وہ اپنے ملک کو اس خطرہ سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے اس تجویز سے فوراً اتفاق کر لیا۔ اور اس سلسلہ کے ابتدائی اقدامات کرکے ایک طرف تو مصری حکومت سے جو ملوکیت کے باعث انگریزوں کے زیر نگین تھی۔ اجازت بھی حاصل کر لی اور دوسری طرف مصر میں برطانیہ کے ہائی کمشنر سرہنری میک ماہن کو اس اہم کام پر مامور کیا کہ وہ مکہ میں سلطنت عثمانیہ کے گورنر "شریف حسین" کو عرب سلطنت کا یقین دلانے کے بعد ترکی کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کریں۔ ۱۹۱۵ء میں برطانیہ عربوں کے خلاف اپنی سازش میں کامیاب ہو گیا اور خلافت کے عنوان سے دنیائے اسلام کی مرکزیت و وحدت پارہ پارہ ہو گئی۔ حکیم الامت علامہ اقبال نے اس سانحہ سے متاثر ہو کر فرمایا تھا:

چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ! اوروں کی عیاری بھی دیکھ

چنانچہ سلطنت عثمانیہ کے کھنڈرات پر برطانوی ڈپلومیسی نے نجد و حجاز اردن، فلسطین، عدن وغیرہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کرکے مسلمانوں کی اجتماعی قوت کے پرخچے اڑا دیئے۔ لیکن بعد میں جزیرہ نمائے سینائی کے موسمی طبعی اور جغرافیائی صورت حال دیکھ کر خود ہی یہودیوں نے یہاں آباد ہونے کا خیال یہ کہہ کر ترک کر دیا کہ یہ لق و دق صحرا اپنے اندر یہودی ایسی ترقی یافتہ قوم کو آباد کرنے کی قطعاً کوئی صلاحیت نہیں رکھتا

ڈاکٹر ہرٹسل نے انگریزی حکومت کا پھر دروازہ کھٹکھٹایا اور اس نے یہودیوں کو افریقہ میں ایک وسیع علاقہ کی پیشکش کر دی لیکن چھٹی یہودی کانفرنس نے اسے نامنظور کر دیا۔ یہ علاقہ دراصل تنزانیہ کا تھا جسے اس وجہ سے نامنظور کیا گیا کہ یہودیوں کے لئے نہ تو اس میں اپنے اعتقادی لحاظ سے کوئی کشش تھی۔ اور نہ ہی آبادی کے لحاظ سے اس میں کوئی جاذبیت موجود تھی!

سنہ ۱۹۰۴ء میں ڈاکٹر ہرٹسل کا انتقال ہو گیا۔ لیکن وہ مرتے مرتے یہودیوں کے لئے قومی بقاء و استحکام کے ایسے نفع بخش مرکز قائم کر گیا۔ جو راندۂ درگاہ قوم کی زندگی کا زبردست سہارا بنی۔ ایک یہودی نوآبادکار بنک دوسرا یہودی بیت المال۔ اس کے بعد بھی صیہونی کانفرنس متواتر منعقد ہوتی رہی۔ جن کے ذریعے یہودی قوم میں زندگی کی روح بیدار کی جاتی رہی۔ دراصل یہودیوں کی نگاہیں فلسطین پر مرکوز تھیں — مگر ترکی کی خلافت عثمانیہ اس بارے میں ایک لفظ بھی سننے کو آمادہ نہ تھی اور نہ ہی فلسطینی مسلمان اور عیسائی باشندے ہی یہودیوں کے وجود کو اس خطہ میں برداشت کرنے پر آمادہ ہو سکتے تھے۔

تفریح بالفور

سنہ ۱۹۱۴ء کی پہلی عالمگیر جنگ عظیم کے ساتھ ہی یہودیوں میں نئی حرکت پیدا ہو گئی۔ یہودی مفکروں اور سیاسی لیڈروں نے فیصلہ کیا کہ جرمنی، ترکی اور ان کے اتحادیوں کی فتح سے انہیں کوئی

فائدہ نہ پہنچ سکے گا۔ لہٰذا انہوں نے برطانیہ کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا
اور اس جنگ میں یہودی سرمایہ داروں نے برطانیہ کی خوب دل کھول کر
مدد کی۔

اس تعاون و امداد اور جدوجہد کا بالآخر نتیجہ یہ نکلا کہ یہودیوں کو اپنے
مقصد میں کامیابی ہوگئی۔ اور ۲ر نومبر ۱۹۱۷ء کو برطانیہ نے یہودیوں کے قومی
وطن کے قیام کی تجویز منظور کر لی۔ تاریخ یہودیت میں یہ دن ایک یادگار
حیثیت رکھتا ہے۔

جس دن تصریح بالفور (Balfour Declaration) کے نام سے تاریخی
دستاویز تیار ہوئی۔ کیونکہ اس وقت برطانیہ کے وزیر خارجہ "لارڈ بالفور" تھے
انہوں نے ہی انگلستان کے مشہور یہودی ساہوکار "لارڈ راتھچیلڈ" کے نام
سرکاری مراسلہ بھیجا تھا۔ جس میں یہودیوں کو خوشخبری سنائی گئی تھی۔ کہ
مسرت کے ساتھ حکومت برطانیہ کی جانب سے آپ کو اطلاع دیتا ہوں
کہ ہز مجسٹی کی حکومت فلسطین میں یہودی قومی وطن کا قیام پسندیدگی کی نظر
سے دیکھتی ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے وہ ہر ممکن کوشش کرے
گی۔ البتہ یہ بات ظاہر ہے کہ حکومت برطانیہ کوئی بات ایسی نہیں کر سکتی
جو فلسطین کے غیر یہودی باشندوں کے مذہبی یا شہری حقوق کے منافی ہو
۔ میں ممنون ہوں گا اگر آپ یہ تصریح صیہونی انجمن تک پہنچا دیں

یہ تصریح دراصل ڈاکٹر حائیم زیمان کی کوششوں سے حاصل ہوئی تھی۔ جو
اس وقت صیہونی انجمن کی انتظامی مجلس کے ممبر تھے۔ اور اب اس

کے صدر ہیں۔ اس تصریح کے صادر ہوتے ہی فرانس، اٹلی، جاپان اور امریکہ نے اسے تسلیم کر لیا۔ یہودیوں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر عملی کاروائی شروع کر دیں۔ ڈاکٹر وائزمان کی قیادت میں ایک وفد فلسطین بھیجا گیا تاکہ برطانوی حکام کی تائید سے یہودیوں کی فلسطین میں آبادکاری کا سامان مہیا کیا جا سکے۔

یہودیوں نے صرف اس پر قناعت نہیں کی۔ بلکہ مجلس اقوام سے بھی اسکی تصدیق چاہی۔ چنانچہ فلسطین کی برطانوی وصیت (مینڈیٹ) کی دستاویز کے دیباچہ میں محرر ہے "تمام اتحادی طاقتیں اس بات پر متفق ہیں کہ برطانوی سلطنت اس تصریح کو عملاً کامیاب بنانے کی ذمہ دار ہے جو ۲ نومبر کو اس کی جانب سے ظاہر کی گئی ہے۔!

'حکومت اس امر کی ذمہ دار ہے کہ ملک فلسطین میں ایک ایسی سیاسی اور انتظامی صورت حال پیدا کرے جو یہودی وطن کے قیام کے لئے ضروری ہے۔ چوتھی دفعہ میں ہے۔

یہ طے پایا گیا کہ یہودیوں کی نمائندہ مجلس میں ایک ذمہ دار مجلس تسلیم کی جائیگی اور ان تمام اقتصادی و اجتماعی معاملات میں اس سے مشورہ لیا جائیگا جن کا تعلق یہودی وطن کے قیام سے ہے۔ الغرض اس دستاویز میں تصریحات بھی موجود تھیں۔ جن سے یہ واضح ہوتا تھا کہ برطانیہ "یہودی ریاست کے قیام میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑے گا۔ اسی مرحلہ میں برطانوی حکمرانوں نے یہ بھی یقین دہانی کرائی تھی کہ ۱۹۱۴ء کی جنگ کے ختم پر فلسطین کو یہودی وطن قرار دے دیا جائے گا۔

فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری

۱۹۲۰ء میں برطانیہ نے اعلان کردیا کہ آئندہ سال سے یہودیوں کو ان کے مجوزہ وطن فلسطین میں آباد کرنے کا سلسلہ شروع کردیا جائے گا۔ اور سترہ ہزار کے قریب "یہود مردود" کی پہلی کھیپ سرزمین بیت المقدس میں بسادی جائے گی۔

برطانیہ کے اس ظالمانہ اور عیارانہ فیصلے پر عربوں نے اگرچہ سخت احتجاج کیا تھا۔ مگر ان دنوں بیشتر سربراہان مملکت دسترخوان افرنگ کے ریزہ چین تھے اس لئے انہوں نے اس اقدام کے مضمرات اور خطرناک پہلو پر کوئی خاص توجہ نہ دی ورنہ اس زمانے میں جب کہ یہ سامراجی طاقتیں عالمگیر جنگ کی ہولناک تباہی سے چکنا چور ہوکر تھکاوٹ کا شکار ہوچکی تھیں اور ایک طویل عرصہ تک آگ اور خون کی ہولی کھیلنے کے بعد ان میں سلسلہ جنگ کو طول دینے کی سکت نہیں تھی۔ ایسے موزوں وقت میں اسلامیان عرب اگر تھوڑی سی ہمت و جرأت کا مظاہرہ کردیتے تو انہیں عصر حاضر کی المناکیوں سے واسطہ

نہ پڑتا۔

برطانیہ کی طرف سے فلسطین کو یہودیوں کا مرکز بنانے کے اعلان کے ساتھ ہٹلر نے بھی جرمنی میں یہودیوں کی نسل کشی کی ایک وسیع اور ہمہ گیر مہم کا آغاز کر دیا۔ گویا مغربی ملکوں نے یہودیوں کے خلاف جو محاذ قائم کر رکھا تھا اس میں تمام ممالک پوری طرح عملاً حصہ لے رہے تھے۔ برطانیہ اگر یہودیوں کی آبادکاری کا خواہاں تھا تو اس کے پس منظر یہی جذبہ کار فرما تھا کہ اس مردود قوم سے کسی طرح نجات مل جائے اور ہٹلر اگر لاکھوں یہودیوں کو مختلف حربے استعمال کر کے صفحہ ہستی سے ملیا میٹ اور نیست و نابود کر رہا تھا۔ تو اس کا مقصد بھی برطانیہ سے مختلف نہ تھا۔ ان حالات میں دنیا بھر کے یہودیوں نے فلسطین کا رخ کرنا شروع کر دیا۔ اور ان کی ایک معقول تعداد وہاں آکر آباد ہو گئی۔

اب امریکہ نے بھی موقع کو غنیمت خیال کرتے ہوئے وہاں کے سرمایہ دار یہودیوں کو اس طرف خصوصی توجہ دلائی چنانچہ خانہ بدوش اور دربدر ٹھوکریں کھاتے والے یہودیوں کے ساتھ ساتھ سرمایہ داروں نے اس علاقہ میں آکر عرب باشندوں کے مکانات، ان کی اراضی اور ان کے کاروباری مرکز خریدنا شروع کر دیئے۔ پھر اپنے تعلیمی ادارے اور سوسائٹیاں قائم کرنے کی ایک منظم اور وسیع المقاصد تحریک کا آغاز کیا۔ اسطرح جب فلسطین میں یہودیوں کی ایک معقول تعداد آباد ہو گئی تو ۱۹۳۰ء میں برطانیہ

نے "پیل کمیشن" کا تقرر کیا جس نے فلسطین کو تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی
۱۹۳۹ء میں برطانوی حکومت نے یہ اعلان کیا کہ وہ دس سال میں
فلسطین کو آزاد کر دے گی نیز آئندہ پانچ برس کی مدت میں قریباً ایک لاکھ
یہودی فلسطین میں آباد کر دیئے جائیں گے۔

اسی سال دوسری عالمگیر جنگ چھڑ گئی تو فلسطینی یہودیوں نے "برطانیہ
اور جرمن" کے باہمی تصادم سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے برطانوی
حکومت سے درخواست کی کہ وہ جرمنوں سے اپنے مظالم کا بدلہ لینے کیلئے
برسرپیکار ہونے کو تیار ہیں۔ بشرطیکہ ہمیں جدید ترین اسلحہ اور دیگر جنگی
ساز و سامان سے پوری طرح مسلح کر دیا جائے۔ انگریزوں نے
اپنی ضرورت کے تحت انہیں اسلحہ جنگ سے پوری طرح لیس کر دیا۔

یہودی لیڈروں نے برطانیہ سے اپنا مقصد پورا کرنے کے ساتھ
ساتھ امریکہ سے گٹھ جوڑ قائم کر لیا اور اپنی وفاداریوں کا جھکاؤ ادھر
زیادہ ظاہر کیا جس کے نتیجہ میں یہود کے لئے برطانیہ سے خطرات کم
ہو گئے۔ اس کا مظاہرہ جولائی ۱۹۴۶ء میں کیا گیا جبکہ انہوں نے اپنا
روائتی کردار پیش کرتے ہوئے بیت المقدس (یروشلم) میں واقع کنگ
ڈیوڈ ہوٹل کو تباہ کر دیا۔ اس میں چونکہ برطانوی حکومت کے دفاتر موجود
تھے۔ اس لئے وہ سخت پریشان ہوئی اور صورت حال کی سنگینی کا احساس
کرتے ہوئے فروری ۱۹۴۷ء کو یہ مسئلہ اقوام متحدہ کے سامنے پیش کیا گیا
اس پر امریکہ اور روس نے یہ تجویز پیش کی کہ یکم اگست ۱۹۴۷ء تک

سرزمین فلسطین سے برطانیہ کا تسلط و اقتدار ختم ہو جانا چاہیئے اور وہاں کے باشندوں (عرب اور یہود) پر مشتمل دو آزاد حکومتیں قائم ہونی چاہئیں چنانچہ ۱۴/۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو سرزمین فلسطین سے برطانوی اقتدار کا سورج غروب ہوگیا۔ اور دوسرے دن "اسرائیل" کے نام یہودی ریاست کے قیام کا اعلان کرکے دنیائے عرب اور اسلامیانِ عالم کے عین قلب میں خطرناک زہریلا خنجر پیوست کر دیا گیا

یہودی ریاست قائم ہوئے ابھی دوسرا دن تھا کہ اکثر مغربی ملکوں اور بڑی بڑی طاقتوں نے اس "مملکت یہود" کا وجود تسلیم بھی کر لیا اور اس کے ساتھ سفارتی مراسم کے اعلانات بھی ہو گئے۔

مسلمانوں اور یہودیوں کے مابین فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کرتے وقت بھی برطانوی عیاروں نے اپنے روایتی انداز میں یہودیت نوازی کا بیّن ثبوت دیا۔ اور تقسیم پنجاب کی طرح یہودیوں کی غالب اکثریت قرار دے کر مسلمانوں کو ان کے تابع کر دیا۔ حالانکہ اس وقت عربوں کی تعداد پانچ لاکھ ساٹھ ہزار تھی اور یہودیوں کی صرف پانچ لاکھ۔ پھر رقبے کی تقسیم میں بھی اسی کی تبدر بانٹے کا مظاہرہ کیا گیا اور اچھے اچھے آباد اور زرخیز علاقے یہودیوں کو عطا کر گئے۔ اوّل تو ایک منظم اور گہری سازش کے تحت سرزمین عرب میں یہودیوں کی آبادکاری کا فعل ہی ظالمانہ تھا۔ اگر یہودیوں کی ذات سے ان مغربی سامراجیوں کو اتنی ہی دلچسپی اور ہمدردی تھی۔ تو ان کے لئے مغرب کا کوئی حسین و جمیل اور

صحت افزا مقام بطور ہدیۂ خلوص پیش کیا جا سکتا تھا۔ اور اگر عرب علاقے میں اس ناسور کی افزائش ضروری ہی سمجھی گئی تھی تو عربوں کے حقوق غصب کرنے اور یہود کی خاطر انہیں "جلاوطن" کرنے کا ظلم کیوں روا رکھا گیا۔؟ آخر یہ کہاں کا انصاف تھا۔

اقتدار کی بدمستی

اس واضح اور صریح زیادتی اور تعدی کے خلاف عربوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑنا ایک فطری امر تھا۔ یہودیوں نے نو وارد ہونے کی حیثیت میں مقامی عرب باشندوں کے ساتھ شریف شہریوں کا سلوک اختیار کرنے کی بجائے نئے اقتدار اور نئی حکومت کے نشہ میں بدمست ہو کر مسلمانوں پر طرح طرح کے ظلم ڈھانا شروع کر دیئے اور جو مسلمان مرد گھروں سے باہر اپنے کام کاج پر چلے جاتے تو ان کی عدم موجودگی میں دہشت پسند یہودی مسلمان عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیتے۔ ان کے گھروں کو آگ لگا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتے۔ اس نوعیت کی غنڈہ گردی اور دہشت گردی کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان بالآخر مجبور ہو کر اس علاقہ سے ہجرت کر جائیں اور یہ پورا علاقہ بلا شرکت غیرے ان کے تصرف و اقتدار میں آجائے!

چنانچہ مسلمان روزمرہ کے سفاکانہ اور ہولناک مظالم سے تنگ آ کر ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہودیوں کی غنڈہ گردی یہیں ختم نہیں ہو جاتی ہے۔ بلکہ وہ ہر اس شخص کو جو ان کی بہیمیت کی زد میں آ جائے اپنے

ختم کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔

اقوام متحدہ نے مسٹر کاؤنٹ برناڈات کو فلسطین بھیجا تاکہ عربوں اور اسرائیل کے درمیان مصالحت کرا دیں۔ وہاں پہنچتے ہی اسے قتل کر دیا گیا۔ اسی واقعہ سے اندازہ لگائیے کہ جو دہشت پسند یہودی اقوام متحدہ کے نمائندہ کو خاطر میں نہ لاتے ہوں اور نہ ہی اقوام متحدہ ان بدمست خونی بھیڑیوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کی جسارت کر سکتی ہو۔ وہاں کوئی عدل و انصاف کی کیسے توقع رکھے۔

اسرائیل اپنے جبر و تشدد اور ظالمانہ پالیسی کے باعث ستمگری کا مترادف نام بن گیا ہے۔ اس یہودی حکومت نے اپنے روز قیام سے آج تک ظلم و تعدی پر مبنی کارروائیوں میں قطعاً کوئی خلا نہیں آنے دیا ہے۔ سنہ ۱۹۵۳ء میں اسرائیل نے باقاعدہ فوج کشی کر کے اردن کے قصبہ قبعیہ پر حملہ کیا اور سنہ ۱۹۵۵ء میں انہوں نے غزہ کا رخ کیا۔ سنہ ۱۹۵۶ء میں جب امریکہ، برطانیہ اور فرانس نے مصر پر حملہ کر کے تحریک حریت عرب کے علمبردار ملک کی سالمیت خطرے میں ڈالنے کی سعی مذموم کی تھی تو اسرائیل نے بھی ان ظالم قوتوں کا ہمنوا ہو کر جنگ میں باقاعدہ حصہ لیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اسلامیان مصر کی جرأت ایمانی اور غیرت اسلامی کی لاج رکھتے ہوئے چھ روزہ کی معرکہ آرا لڑائی کے بعد قائد انقلاب جمال عبدالناصر کی قیادت میں فتح و نصرت عطا فرمائی اور دشمنان اسلام خائب و خاسر ہو کر رہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ ۱۹۵۶ء میں جب کہ حکومت مصر نے نہر سویز پر قبضہ کرنے اور وہاں سے انگریزوں کو نکال باہر کرنے کا فیصلہ کیا تھا اسے ان مغربی سامراجیوں (امریکہ، برطانیہ وغیرہ) نے اپنی سخت ہتک اور توہین سمجھا تھا اور ۱۹۶۷ء کی حالیہ جنگ اور اسرائیلی جارحیت درحقیقت ان طاقتوں کے جذبہ انتقام اور ان کے ظالمانہ کردار کا نہایت شرمناک مظاہرہ ہے۔ جس کے سبب اہل اسلام اپنے قبلۂ اوّل بیت المقدس سے محروم کر دیئے گئے۔ ہزاروں معصوم بچے، بوڑھے، عورتیں اور ہسپتالوں میں پڑے مریض ان سامراجیوں کے سفاکانہ مظالم کا شکار ہو کر لقمہ اجل بن گئے۔ اور لاکھوں عرب باشندوں کو ان کے وطن اور گھر بار سے بزور نوک سنگین نکال باہر کر کے جلا وطنی اور غربت و افلاس کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا گیا اور ہنوز یہ سلسلہ بدستور جاری ہے

یہود و نصاریٰ
کے اتحّاد کا پس منظر

یہاں پر ایک سوال اپنی پوری اہمیّت کے ساتھ سامنے آتا ہے کہ مغرب کی عیسائی "اور لامذہب" تو میں جو تاریخ کے ہر دَور میں یہودیوں کی نسل کشی اور انہیں صفحہ ہستی سے نیست و نابُود کرنے پر تلی ہوئی تھیں وہ "یہودی قوم" کے تحفظ و بقار کے لئے اچانک اتنی مہربان کیوں ہوگئی ہیں۔ اور وہ کون سے اسباب و محرکات ہیں جو اقوام مغرب کے لئے یہود کے وجودِ نامسعُود پر دیوانہ وار جاں نثاری کا سبب بن رہے ہیں۔

اس کا پس منظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کا جو دَور مسلمانوں کی عظمت شوکت اور عروج کا زمانہ شمار ہوتا تھا مغربی اقوام کے لئے وہ

پستی اور ذلت کا دور تھا۔ سولہویں صدی عیسوی تک تمام یورپی قوموں کی واحد درسگاہ اسلامی سلطنت اسپین تھی۔ انقلاباتِ زمانہ نے صنعتی اور مادی وسائل کی فراوانی کے دروازے ان مغربی اقوام پر چوپٹ کھول دیئے اور مادی ترقیوں نے پہلی مرتبہ ان قوموں میں برتری اور بالادستی کا احساس پیدا کیا تو اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ حکومت و اقتدار اور اس کی وسعت پذیر خواہشات سے بھی مالا مال ہوتے۔ ان امنگوں اور خواہشات کی تکمیل میں خلافتِ عثمانیہ کی وسیع و عریض مملکت اور دنیائے اسلام کی۔ وحدت و مرکزیت ایک کوہِ گراں بن کر حائل ہو رہی تھی ان قوموں نے برسوں کی محنتِ شاقہ اور گہری سازشوں کے ذریعہ اس کا دامن تار تار کر دیا۔ اور ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم نے ان کے تمام سہانے خواب شرمندۂ تعبیر کرنے میں زبردست کامیابی عطا کی۔

اب ان مغربی طاقتوں نے پورے اطمینان کے ساتھ بلا روک ٹوک ہوس ملک گیری اور اپنے وسعت پسندانہ عزائم کی تکمیل شروع کی۔! اور شدت کے ساتھ یہ محسوس کیا کہ جس طرح مادی اور صنعتی ترقی ان قوموں کے عروج اور ان کی عظمت و فوقیت کا باعث بنی ہے اسی طرح مادی اور صنعتی ترقی کے تمام وسائل اور ذرائع کا دار و مدار چونکہ تیل اور پٹرول کی پیداوار پر ہے اس لئے اس میدان میں اپنی بالادستی اور عظمت منوانے کے لئے ضروری ہے کہ تیل اور پٹرول کے ذخائر اور متعلقہ معدنیات پر بھی کسی طرح قابو پا لیا جائے۔

ظاہر ہے کہ اس اہم اور وسیع مقصد کی تکمیل میں جو اتحاد اور اتفاق بمصداق اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ (یعنی کفر ایک ملت ہے) کا ہو سکتا ہے وہ مختلف الخیال اور مختلف قوموں کی موجودگی میں ممکن نہیں اس لئے بڑی چالاکی اور نہایت گہری سازش کے تحت گذشتہ سے پیوستہ سال پاپائے روم نے دنیا کے یہودی اور عیسائی ربیوں اور پادریوں (بڑے بڑے رہنماؤں) کی ایک اہم کانفرنس میں ان کے کئی ہزار برس کے پرانے جھگڑے بقول نصاریٰ وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا عِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ (کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو یہودیوں نے پھانسی پر لٹکایا ہے) کا فیصلہ کرتے ہوئے اور اس مسئلہ پر یہودیوں اور عیسائیوں کی باہمی پرانی چپقلش کے خاتمے کا اعلان کر کے پوری دنیا کو محو حیرت کر دیا

یہودیوں کا قتل مسیح سے کوئی
تعلق نہیں، یہ قوم اس الزام سے
بری قرار دی جاتی ہے۔

اس گھناؤنی سازش اور اس کے در پردہ محرکات ملحوظ رکھ کر ایمانداری کے ساتھ فرمایئے کیا صدیوں پرانے جھگڑے کا یہ ڈرامائی فیصلہ اور اس طرح کا گٹھ جوڑ کسی گہری سازش کا غماز نہیں تو اور کیا ہے؟ آخر وہ کیا مقاصد تھے جن کی حسن آفرینیوں اور برق بیانیوں نے آگ اور پانی کو یکجا کر دیا اور ایک دوسرے کے خون کی پیاسی قومیں باہم شیر و شکر ہو گئیں؟

وہ مقاصد صرف اور صرف اہل اسلام سے مادی اور صنعتی وسائل

کی کلید (تیل اور پٹرول) حاصل کرنے کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں؟
اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی اور فضل گستری ہے کہ تیل کے چشمے اور سونے
کے ذخائر بیشتر عرب ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔
اور مغربی ممالک اپنی وسعت پذیر ترقی کے باوجود ان نعمتوں کی فراوانی
سے محروم ہیں۔ عرب ملکوں کی یہ ادنیٰ "عظمت اور برتری" ان قوموں
کو ایک خار بن کر کھٹک رہی ہے۔
چنانچہ اسی مادی ترقی کے "باب" اور دروازوں کی حیثیت رکھنے
والی چیزوں خواہ وہ تیل اور پٹرول کی شکل میں ہوں یا نہر سوئز کی صورت
میں وہ سونے اور چاندی کے ذخائر ہوں یا درۂ دانیال کا تجارتی و
جہاز رانی کا اہم مرکز! مغربی طاقتیں اہل اسلام کے براہِ راست
قبضہ و تصرف کی کوئی چیز بھی برداشت کرنے کو آمادہ نہیں ہیں۔
ظاہر ہے کہ ان اہم مقاصد کی تکمیل کے لئے جو محاذ یہود و نصاریٰ
کا باہم قائم ہو سکتا ہے۔ فرزندانِ توحید میں سے کوئی گنہگار سے گنہگار
مسلمان بھی اس کے لئے شائد آمادہ نہ ہو سکے۔ اس لئے ان تمام سامراجی
طاقتوں نے تعاون اور اختلاف کی مختلف شکلوں میں "اسرائیل" کو مضبوط
اور مستحکم کرنے کا ایک وسیع پروگرام مرتب کر رکھا ہے۔ اور "اسرائیل"
عرب ممالک کے خلاف جب بھی جارحیت کا ارتکاب کرتا ہے تو عربوں
کی اشک شوئی کے لئے مغربی طاقتیں نہایت مستعدی کے ساتھ ہمدردی
کا مظاہرہ شروع کر دیتی ہیں اس طرح دنیا کی توجہ اقوامِ متحدہ کے فیصلے

پر مرکوز ہو جاتی ہے اور درحقیقت یہ ڈرامہ اسرائیل کے فوجی مفادات کو استحکام دینے اور اسے اپنی پوزیشنوں کو "دوام" بخشنے کے لئے کھیلا جاتا ہے اور اس اثناء میں دنیائے عرب اور عالم اسلام کو ایسے ایسے دور رس کار مسائل میں الجھائے رکھا جاتا ہے جو ان کی تعمیر و ترقی میں سد راہ بن کر حائل ہوں۔

سامراجیوں کا خطرناک حملہ

صدر جمال عبدالناصر کو جب مغربی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں اور عربوں کی سالمیت کیخلاف خطرناک جنگی سرگرمیوں کا پورا یقین ہو گیا اور قبرص میں واقع برطانوی فوج کی پراسرار نقل و حرکت شروع ہو گئی تو انہوں نے حفاظتی اقدامات کے سلسلہ میں خلیج عقبہ کو بند کرنے کا اعلان کر دیا تاکہ سامراج کی امداد اس راستے سے اسرائیل کو نہ پہنچ سکے۔ خلیج عقبہ کی بندش پر امریکہ اور برطانیہ میں ایک کھلبلی مچ گئی کہ عربوں نے ہمارے خطرناک جنگی عزائم کو بھانپ لیا اور یہ خلیج کی بندش اس خطرے کے "الارم" کی حیثیت رکھتی ہے عرب ممالک (متحدہ عرب جمہوریہ، سعودی عرب، اردن، عراق، شام) کا یہ فیصلہ اپنے ممالک کے داخلی معاملات سے تعلق رکھتا تھا اور قانوناً و اخلاقاً انہیں اس بات کا پورا حق حاصل ہے کہ وہ ملکی تحفظ و استحکام کے سلسلہ میں جب چاہیں اپنا دروازہ ان اغیار کے لئے بند کر دیں جو ان کی آزادی سلب کر لینے کے ناپاک عزائم رکھتے ہوں اور ان کا وجود ختم کر دینے کے درپے ہوں

عربوں کے اس بروقت اعلان نے جنگ باز سامراجیوں کے "مزاج شریف" میں ایک برہمی پیدا کردی۔ چونکہ وہ ۱۹۵۶ء سے نہر سویز کی بندشش اور وہاں سے ذلیل وخوار ہو کر ملک بدر ہونے کے صدمے کا بدلہ چکانے پر ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ اس لئے انہوں نے پورے جذبۂ انتقام کے ساتھ عربوں کو تختۂ مشق ستم بنانے کا فیصلہ کیا چنانچہ اسرائیل کی بجائے "پہلے" امریکہ اور برطانیہ نے اپنے جنگی منصوبوں کو بروئے کار لاتے ہوئے عربوں کو دھمکی دی کہ خلیج عقبہ کی ناکہ بندی بزور قوت توڑ دی جائے گی۔

صدر ناصر اور شام نے اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے لئے اپنے ملکوں سے تمام سامراجی ایجنٹوں (مغربی اخبارات اور خبر رساں ایجنسیوں کے نمائندوں اور ان کی دیگر فرموں کے نمائندوں) کو نکل جانے کا حکم دیا اور سامراجیوں کے خلاف اپنی گرفت ذرا مضبوط کی تو امریکہ اور برطانیہ نے نہایت عیاری سے کام لیتے ہوئے اسرائیل کو آمادۂ پیکار کر دیا اور دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کو یہ اعلان کر دیا کہ مشرق وسطیٰ کے بارے میں وہ کسی قسم کی مداخلت نہیں کریں گے۔

اس اثناء میں امریکہ نے اپنے چھٹے بحری بیڑے کو بحیرۂ روم میں اس بہانے داخل کر دیا کہ وہ خاص حالات میں نگرانی کے فرائض انجام دے گا۔ تاکہ دنیا کی کسی اور طاقت کو اس علاقہ میں مداخلت کا موقع نہ مل سکے۔ گویا عدم مداخلت کا اعلان کرتے ہوئے عملی طور پر مداخلت بھی کردی

(ممکن ہے امریکی اصطلاح میں طیارہ بردار جہازوں پر مشتمل بحری جنگی بیڑے کو جدید ترین اسلحہ سے لیس کرکے کسی علاقے میں داخل کردینے کو مداخلت نہ سمجھا جاتا ہو۔)

اُدھر روس نے مشرقِ وسطےٰ میں براہِ راست مسلح امریکی مداخلت کا جواب دینے کے بہانے ترکی سے درہ دانیال استعمال کرنے کی اجازت لیکر آبنائے باسفورس کے راستے اپنا بحری بیڑہ بھی بحیرۂ روم میں لا کھڑا کیا بڑی طاقتوں کے اس ڈرامے کو دیکھ کر دُنیا کا تاثر یہ تھا کہ مشرقِ وسطےٰ سے جنگ کے مہیب بادل چھٹ جانے کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں اور مزید براں یہ کہ برطانیہ کے خاطر وزیر اعظم ولسن نے عین ہنگامی حالات کے دوران روس اور امریکہ کے سربراہانِ مملکت سے ملاقاتوں کا ایک طویل سلسلہ شروع کردیا اور صدر امریکہ پر زور دیا کہ اسرائیل کو عربوں پر حملہ کرنے سے روکے بعد ازاں کوسیجن سے ملاقات کے دوران صدر جمال عبدالناصر کو اسرائیل پر حملہ سے باز رکھنے پر زور دیا۔!

ناصر سے ملاقات کے بعد ولسن کی صدر امریکہ سے ملاقات ہنوز جاری تھی کہ یکایک اسرائیل نے متحدہ عرب جمہوریہ اردن اور شام پر یک بارگی حملہ کردیا۔ اور بارہ بارہ سو کی تعداد میں جدید ترین امریکی و برطانوی اور اسرائیلی فضائیہ کے بڑاکا طیاروں نے دس دس مرتبہ ان عرب ملکوں کے ہوائی اڈوں۔ فوجی ٹھکانوں اور قاہرہ وغیرہ شہری آبادی پر لاتعداد مہلک بم برسانے شروع کردیئے! اسطرح عربوں کی فضائیہ

قوت اگرچہ مفلوج ہوکر رہ گئی تھی لیکن انہوں نے نہائیت جرأت جانمردی اور پورے جوشِ اسلامی اور جذبۂ جہاد میں سرشار ہوکر ان دشمنانِ اسلام (امریکہ ۔ برطانیہ ۔ اسرائیل) کے سفاکانہ حملوں کا بے جگری کے ساتھ مقابلہ کیا ۔ امریکہ چونکہ "ویٹ نام" کی خفتِ مٹانے اور صدر جانسن آئندہ الیکشن میں ناکامی و رسوائی کا منہ دیکھنے سے زبردست خائف تھا ۔ اس لئے مشرقِ وسطیٰ کے مظلوم اور مجبور مسلمانانِ عرب کو انہوں نے اپنی اغراضِ مشومہ اور ناپاک ہوس کا تختہ مشق بنا کر اپنے اعمالنامۂ سیاہ میں ناکامیوں اور نامرادیوں کی جگہ کامیابیوں کے داغ دھبے ڈالنے کی سرتوڑ کوشش سے کام لیا ۔ اور اپنی طاغوتی قوت و سازش کے ذریعے لاکھوں مسلمانانِ عرب کو بموں ۔ گولوں اور نیپام بموں کے ذریعے جامِ شہادت پلایا اور لاتعداد فرزندانِ توحید کو ان کے گھروں سے نکال باہر کیا اور دنیائے اسلام کے مقدس ترین قبلۂ اوّل بیت المقدس کا سینہ بموں سے چھلنی کرکے اپنی ہوسِ ملک گیری کے لئے بظاہر تسکین کا سامان فراہم کرلیا اور بہت سا قیمتی خطۂ عرب یہود نامسعود کے قبضہ و تصرف میں دے دیا گیا اور سلامتی کونسل کی قرار داد جنگ بندی کے باوجود امریکہ و برطانیہ کے اشارۂ ابرو پر اسرائیل نے عربوں کے خلاف اپنی جارحیت اور اپنے سفاکانہ مظالم کا سلسلہ اس وقت تک جاری رکھا جب تک کہ اس نے حسبِ منشاء فوجی اور اقتصادی اہمیت کے اکثر مقامات پر پورا تسلط نہیں جما لیا ہے ۔

جنگ
عربوں کے نام پر کیوں ؟

پاکستان میں متحدہ عرب جمہوریہ اور ناصر کے خلاف پروپیگنڈا کرنے
یں جو حلقے مغربی سامراج کی نیابت کے فرائض انجام دے رہے ہیں
ان میں سرفہرست جماعت اسلامی ہے - اور یا وہ لوگ ہیں جنہیں
جلالۃ الملک کے شاہی دسترخوان پر حاضری کی نعمت غیر مترقبہ
سے بہرہ ور ہونے کی سعادت حاصل ہے -

ان لوگوں نے پروپیگنڈے کے تمام وسائل و ذرائع اسرائیل اور اسلام
کے ازلی دشمنوں (امریکہ و برطانیہ وغیرہ سامراجیوں) کی مخالفت کی بجائے
اہل اسلام ہی کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دیئے ہیں - اور اس سلسلہ
میں انہوں نے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خوف سے بے نیاز ہو کر ایسی ایسی
لن ترانیاں کی ہیں کہ صداقت اور شرافت اپنا سر پیٹ کر رہ گئی ہیں -
مصر و شام اور ناصر کے خلاف پروپیگنڈے کی یہ مہم دیکھ کر ایسا محسوس
ہوتا ہے گویا اسرائیل سے مسلمانوں کی کوئی جنگ نہیں بلکہ ناصر اور مصر کے

کے خلاف محاذ قائم ہے

جمال عبدالناصر کوئی "معصوم عن الخطا" شخصیت نہیں اور نہ ہی اس نے کبھی "منزہ عن الخطا" ہونے کا دعویٰ کیا ہے لیکن یہ عجیب ستم ظریفی ہے۔ کہ مشرق وسطیٰ میں صرف یہی ایک شخص تمام گناہوں کا سزاوار ٹھہرایا جارہا ہے اور سعودی عرب اردن اور دوسرے عرب سربراہوں کو معصوم عن الخطا اور ہر قسم کے عیب سے پاک سمجھا جارہا ہے یہ انداز فکر آخر کس آیت کریمہ کی رو سے جائز ہے؟

کراچی کے ایک موقر اخبار میں پیر علی محمد راشدی نے (جسے صحافی حلقوں میں ابو مسلم خراسانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) عرب واسرائیل کے زیر عنوان دو قسطوں میں اپنا پورا زور قلم اس بات کو ثابت کرنے میں صرف کردیا ہے کہ اس جنگ میں شکست کی تمام تر ذمہ داری مصر اور ناصر پر عائد ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"امریکہ کو متاثر کرنے اور دشمنی سے باز رکھنے کے لئے جناب ناصر نے یہ کیوں نہیں کیا۔

(۱) مسئلہ اسرائیل کو تنہا عربوں کا مسئلہ نہ بنایا جائے

(۲) شاہ فیصل کی تجویز کے مطابق اس کو عالم اسلام کا مسئلہ بنایا جائے

(۳) اسی تجویز کے تحت دنیا کی ساری مسلم ریاستوں کے سربراہوں کو اکٹھا کیا جائے اور یہ مسئلہ ان کے سامنے رکھا جائے تاکہ مسئلہ کی اہمیت

بڑھ جائے اور مسئلہ صرف علاقائی یا نسلی مسئلہ نہیں بلکہ ایک بڑا عالمی مسئلہ بن جائے۔ (روزنامہ جنگ سنڈے ایڈیشن، ۱۱ جون ۱۹۶۷ء)

مقالہ نگار کی مندرجہ بالا خط کشیدہ عبارت کو بغور ملاحظہ فرمائیے اور اندازہ لگائیے کہ اسلام کی ہمدردی کے نام پر سامراجی طاقتوں کی نمائندگی کس خوبصورتی سے کی گئی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ راشدی صاحب، کو یہ معلومات کس نے فراہم کیں کہ اگر اسرائیل کا مسئلہ عربوں کی بجائے عالم اسلام کا مسئلہ بنا دیا جائے تو امریکہ عربوں کی دشمنی سے باز رہ سکتا ہے! حالانکہ امریکی سامراج کی دوستی اور دشمنی راشدی صاحب کے خیالات و تصورات کی پابند نہیں ہے امریکہ کے اپنے سامراجی مفادات ہیں اس لئے مسئلہ صرف عربوں کا ہو یا پورے عالم اسلام کا اسے مسلمانوں کی سربلندی کی کوئی بھی صورت گوارا نہیں۔ بلکہ ہماری دیانتدارانہ رائے ہے کہ عربوں کے مسئلہ کو اگر آج پورے عالم اسلام کا مسئلہ بنا لیا جائے تو اس سے حالات کے مزید خطرناک ہو جانے کا اندیشہ ہے کیونکہ موجودہ صورت حال کی موجودگی میں وہ تمام غیر مسلم ممالک جو امریکہ سے نظریاتی اختلاف کی بنا پر عربوں کی حمایت کر رہے ہیں، الکفر ملۃ واحدۃ کے اصول کے پیش نظر عربوں کی حمایت سے دستکش ہو جائیں گے اور یہ ایک ایسی خوفناک صورت حال ہو گی جس کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیا کوئی صحیح الدماغ انسان کربل کو اسلام کے نام پر اس طرح بے یار و مددگار چھوڑ دینے کو جائز قرار دے سکتا ہے؟

ہمارا موقف یہ ہے کہ ان معروضات کو اسلام اور مسلمانوں کی وحدت و

مرکزیت کے مؤقف کی مخالفت نہ سمجھ لیا جائے۔ دنیائے اسلام کی موجودہ صورت حال دفاعی اور فوجی نکتۂ نگاہ سے ایسی نہیں ہے یہ اقدام اسی صورت میں مفید اور نتیجہ خیز ہو سکتا ہے جب دنیائے اسلام عصر حاضر کی دفاعی و فوجی ضروریات کی خود کفیل بن جائے اور غیروں سے اسلحہ اور دیگر سامان جنگ حاصل کرنے کی احتیاج کلیتہً ختم ہو جائے کسی قسم کی دفاعی تیاری اور حفاظتی اقدامات کے بغیر محض جذبات کی رو میں بہہ کر کوئی غیر دانشمندانہ اقدام خودکشی کے مترادف سمجھا جاتا ہے! پوری تیاری اور مکمل انتظامات کے بعد مسلمانوں کی نجات اور فلاح اسی میں ہے کہ وہ "اتحاد عالم اسلام" کے نام پر اپنا ایک خود مختار اور غیر جانبدار "اسلامی بلاک" قائم کریں۔ اور کفار کی ہر قسم کی بالادستیوں کے بوجھ سے پوری طرح آزاد ہو جائیں۔

یونیورسٹی یا اسلحہ سازی

یہ ایک المیہ ہے کہ دنیائے اسلام کی حقیقی آزادی و خود مختاری میں بعض عاقبت نا اندیش ارباب اقتدار بری طرح آڑے آرہے ہیں اور کوئی موثر کردار ادا کرنے کی بجائے ایسی ایسی باتوں میں مقابلے و مسابقت کا رُخ اختیار کر رہے ہیں جن کی حیثیت "پانی بلو کر مکھن نکالنے کی کوشش" کے ماسوا اور کچھ نہیں ہے!

سعودی عرب میں قاہرہ کے جامعہ "الازہر" کی مخالفت میں جب "مدینہ یونیورسٹی" قائم کی جانے لگی تو رابطہ عالم اسلامی کے ایک ممتاز عالم دین اور ایک مشہور عربی انشاء پرداز مصنف نے حضرت مولانا شاہ

عبدالقادر رائے پوری رحمتہ اللہ علیہ سے لاہور میں حاضر خدمت ہو کر "مدینہ یونیورسٹی" کے قیام کے سلسلہ میں شاہ سعود کے عزائم اور آئندہ پروگراموں کا ذکر کیا تو حضرت رائے پوری رحمتہ اللہ علیہ نے بلا توقف فرمایا

"ارے ! اس بادشاہ سلامت ! سے کہو کوئی کام کرے کام !
اس طرح کی یونیورسٹیاں جامعہ ازہر کو کیا نقصان پہنچا سکیں گی۔ اسے کہو اپنی اور دنیائے اسلام کی خیر چاہتے ہو تو سعودی عرب میں فولاد کا کارخانہ لگاؤ اسلحہ سازی فیکٹریاں قائم کرو اور ملک کی دولت کو اپنی ذاتی شوکت و حشمت پر ضائع کرنے کی بجائے اہل اسلام کی عظمت و شوکت اور ان کی عزت و آبرو بچانے پر صرف کرو !

اللہ اللہ ! حضرت رائے پوری رحمتہ اللہ علیہ کی فراست ایمانی ملاحظہ فرمائیے کہ انہوں نے حالات کی نزاکت اور سنگینی کا احساس کرتے ہوئے دنیائے اسلام کو بروقت متنبہ کر دیا تھا۔ اب یہ دنیائے اسلام کا کام ہے کہ وہ ملک و ملت کے دفاع و استحکام اور ان کی ترقی و سربلندی کے وسائل پر دولت و سرمایہ خرچ کرنے کی بجائے بڑی بڑی کاروں کوٹھیوں، سامان تعیش اور لاتعداد ایسی ملوں اور فیکٹریوں پر لگادیں جو ہمارے طبوعات تیار کریں یا روزمرہ استعمال کی چیزیں۔

ان چیزوں کی افادیت اور ضرورت اپنی جگہ مسلّم ! لیکن سوال یہ ہے کہ دنیائے اسلام کے ملوک و سلاطین شیوخ و حکمران۔ جن کی اربوں، کھربوں دولت برطانیہ اور دوسرے مغربی ملکوں کے خزانۂ عامرہ میں

پڑی نہ صرف یہ کہ اُن ممالک کی ترقی و خوشحالی کی کفیل ہے بلکہ اسی دولت و سرمایہ سے چلنے والے اسلحہ ساز کارخانے اہلِ اسلام پر نکبت و ادبار کی ہلاکت خیزیاں اور تباہ کاریاں لانے کا موجب بن رہے ہیں

مقامِ شکر ہے کہ ــــــ مشرقِ وسطیٰ کی حالیہ بربادیوں اور قیامت خیزیوں نے بعض حکمرانوں کی چشم بصیرت وا کردی ہے اور انہوں نے اپنی بے اندازہ دولت سامراجی خزانوں سے نکال لینے کا فیصلہ کیا ہے اس سلسلہ میں "شیخ کویت" کا بروقت فیصلہ اور "بنک آف انگلینڈ" سے اپنا سرمایہ واپس لینے کا دانشمندانہ اقدام دنیائے اسلام کے لئے ایک "مشعلِ راہ" کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ اب یہ سرمایہ اہلِ اسلام ہی کی "عظیم" دفاعی اور دیگر مادی ضروریات کی تکمیل میں صرف کیا جائے گا اور "والئی کویت" نے حمیّت اسلامی اور غیرت ملی کا جو مظاہرہ کیا ہے اس کی تقلید میں باقی دنیائے اسلام کے سربراہ بھی اپنے سرمایہ سے مغربی سامراج کو بہرہ ور کرنے کی بجائے اپنے تمام وسائل و ذرائع اہلِ اسلام کے تحفظ و بقاء اور ان کی ترقی و سربلندی کے لئے وقف کردیں گے۔

مغربی پروپیگنڈا
پُراسرار طریق کار

اسرائیل کے جارحانہ حملے کے بعد سامراج کے بدنام زمانہ ادارہ (سی آئی اے) پوری مستعدی اور ہوشیاری کے ساتھ حرکت میں آگیا اور عربوں کے خلاف میدان جنگ میں فوجی کامیابیوں کے ساتھ ساتھ دنیائے عرب سے باہر مختلف اسلامی ملکوں میں پروپیگنڈے کی ایک زبردست مہم شروع کردی گئی جس میں یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ حالیہ جنگ کا اصل ذمہ دار اور قصور دار کون ہے؟ اور آخر کیا وجہ ہے کہ ایک چھوٹی سی ریاست کے معدودے چند باشندے (یہودی) کروڑوں عربوں پر فتح حاصل کرجاتے ہیں؟ اس طرح کے مختلف سوالات مرتب کرکے ان سامراجیوں کی طرف سے گمراہ کن اور بہتان آمیز پروپیگنڈے کے ذریعہ لوگوں کی توجہ حقیقی دشمنوں سے ہٹاکر خود مسلمانوں کی جانب مبذول کرنے کی جو ناپاک کوشش کی جارہی ہے وہ حد درجہ افسوسناک ہے۔

وہی ذبح بھی کرے ہے اور لے ثواب الٹا

مغربی پروپیگنڈا بازوں نے یہودی سرمائے کے بل بوتے پر مختلف اخبارات و رسائل اور خبر رساں ایجنسیوں کی وساطت سے حالیہ جنگ کے روز اوّل سے ہی پروپیگنڈے کا یہ انداز اختیار کیا کہ فتح و نصرت کا ہر پہلو، اسرائیل سے وابستہ ہو اور شکست و ہزیمت کی ہر بات متحدہ عرب جمہوریہ اور ناصر کے ماتھے پر چپکا دی جائے چنانچہ آپ سی آئی اے کے کارہائے نمایاں اور معرکۂ کار گذاری ملاحظہ فرمائیں کہ اے ، پی کے زیر اہتمام کسی مصنوعی جنگ کے مظاہرے کی تصویر لیکر انہیں قاہرہ پر بمباری کا منظر بتایا گیا اور مختلف محاذوں کے ٹینک اور قیدیوں کو خواہ وہ ویٹ نام کے محاذ سے ہی کیوں نہ متعلق ہوں انہیں متحدہ عرب جمہوریہ اور شام کی شکست خوردہ عربوں کی فوج ظاہر کرکے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی گئی۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ تمام جنگی تصویریں اور خبریں فرضی تھیں بتانا مقصود یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر جعلی اور فرضی تھیں جو صرف مصر اور شام کی بدنامی اور رسوائی کے لئے پیش کی گئیں پس سوال پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ جنگ تو تمام عرب ملکوں (مصر، شام، اُردن، سعودی عرب وغیرہ) کی جانب سے متحدہ فوجی محاذ میں لڑی گئی ہے لیکن بدنامی اور نفرت کی مہم صرف ناصر کی ذات کے خلاف کیوں چلائی جا رہی ہے ؎

تم ہی بتلاؤ! کہ آخر قصہ کیا ہے؟
ہم اگر بات کریں گے تو شکایت ہوگی

عربوں کی اسلام پسندی

مغربی پروپیگنڈہ بازوں نے بڑی شدومد کے ساتھ یہ پروپیگنڈہ شروع کر رکھا ہے کہ عربوں میں "اسلام" نہیں ہے اور اسلام کی اگر کوئی جھلک دکھائی دیتی ہے تو وہ ہمارے ہاں ہے نیز یہ کہ عرب ذلیل اور کم ہمت ہیں۔ ان میں جوشِ ایمانی اور جذبۂ جہاد مفقود ہے ۔

جماعتِ اسلامی کے ترجمان "ایشیا" لاہور نے "کیا عربوں کو اسلام کی طرف بلانے کی کوئی سبیل ہے ؟ ایک عرب دوست کا جینوا سے خط" کے زیر عنوان ایک مضمون شائع کر کے اس کی کاپیاں (اسی پرچے میں شائع شدہ اعلان کے مطابق) تمام مسلم سربراہانِ مملکت اور عظیم دینی راہنماؤں کے نام ارسال کی ہیں۔ اس میں لکھا گیا ہے۔

"کیا عربوں کو اسلام کی طرف واپس لانے کی کوئی سبیل ہے ؟ کیا وہ عقل کے ناخن لیں گے اور جس غلط راہ پر وہ چل رہے ہیں کیا اس سے واپس آسکیں گے ؟؟"

آگے لکھا ہے۔

عرب قوم بڑی مسکین ہے اور عرب فوج اس سے بھی مسکین تر

ذلیل وکمزور اور بے روح۔ ڈکٹیٹر شپ نے اِسے پاؤں کے نیچے مسل ڈالا ہے۔ اس بے چاری کے اندر کہاں یارا کہ وہ اسرائیلی فوج سے لڑ سکے جس کا ہر سپاہی بھی اپنے قائدین سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا ہے۔ بعض مغربی اخبارات نے لکھا ہے۔
مصری فوج کے افسر عیش و تنعم میں غرق ہیں اور عام سپاہی درماندہ اور لاغر و نحیف ہے"
مصری فوج اپنے قائد کے سامنے حاضر ہوتا ہے تو کانپ رہا ہوتا ہے اور بڑی لجاجت اور عاجزی سے کہتا ہے" نعم یا بیہ" فرمائیے میرے آقا مگر اسرائیلی سپاہی اپنے قائد اعلیٰ جنرل موشے دایان کو جب بلاتا ہے تو کہتا ہے یا موشے"۔

(ایشیا لاہور ۱۶ر جولائی ۱۹۶۷ء)

سرزمین عرب چونکہ اسلام کا مرکز و منبع ہے اور دنیا سے کفر و باطل کی تاریکیاں دور کرنے کی منور کرنیں اسی خطہ سے پھوٹ کر اقصائے عالم میں پھیلی ہیں اس لئے مغربی طاقتوں کی ساری توجہ اسی علاقے پر مرکوز ہے وہ اس سرزمین کی روحانی اور مادی مرکزیت کو لمحہ بھر کے لئے برداشت کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ ان طاقتوں نے اسلام کی روحانی اور مادی مرکزیت ختم کرنے کے لئے دو محاذ قائم کر رکھے ہیں۔
عربوں کے مادی وسائل (نہر سویز اور پیٹرول وغیرہ) بزور قوت حاصل کرنے کے لئے اسرائیل کی پیٹھ ٹھونکی جا رہی ہے اور اسے جدید ترین اسلحہ

سے لیس کرکے مسلمانوں کے مرکزی مقدس مقامات پر بزور شمشیر قبضہ کیا جارہا ہے لیکن دوسرا محاذ چونکہ وسیع پروپیگنڈے کا متقاضی ہے اس لئے پورے خطۂ عرب کے بارے میں یہ مہم چلائی جارہی ہے کہ وہاں اسلام کا وجود نہیں ہے! اس طرح مغربی سامراج اگر دنیا کو باور کرانے میں کامیاب ہوگیا کہ واقعی عربوں میں اسلام نہیں ہے اور اسلام کا مرکز و منبع اس نعمت سے محروم ہوگیا ہے تو باقی دنیا کے "اسلام" کو ختم کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔

مندرجہ بالا اقتباس کا ایک بار پھر مطالعہ فرمائیے اور اس فقرہ پر خصوصی توجہ دیجئے "کیا عربوں کو اسلام کی طرف لانے کی کوئی سبیل ہے؟" یہ فیصلہ کسی ایک فرد یا شخصیت کے متعلق نہیں بلکہ پوری عرب قوم اور پورے خطے کی بابت ان کے اسلام سے منحرف ہونے کا اعلان کیا جارہا ہے

گنہگار اور بے عمل مسلمان دنیا کے ہر خطہ میں موجود ہیں۔ اگر آج چند افراد کی بے عملی یا ان سے سیاسی اختلاف کے باعث ان کا اسلام سے انحراف تسلیم کرلیا جائے تو دنیائے اسلام میں سے کونسا ملک ایسا ہے جس کے گنہگار باشندوں کی "عملی زندگی" موضوع بنا کر پھر ان کے انحراف اور اسلام سے تہی دامن ہونے کا فتویٰ صادر نہ کیا جاسکے گا۔

کیا دنیا میں اسلام کا مرکز سوئٹزرلینڈ کا جنیوا ہی باقی رہ گیا ہے۔ جس کے ایک رکن نے مولانا مودودی کے ایک پرائیویٹ سیکرٹری خلیل حامدی کے نام یہ معلومات افزا خط لکھ کر زبردست انکشاف فرمانے کی کوشش

کی ہے اور پھر جماعت اسلامی نے اس خط کو "منزل من اللہ" سمجھ کر اس
کی تبلیغ واشاعت کو عصر حاضر کا سب سے بڑا فرض اور تقاضا قرار دیا ہے
"جنیوا کے اسلامی سنٹر" کی بابت ممکن ہے بعض حضرات تفارتی
معلومات نہ رکھتے ہوں۔ یہ امریکی منڈی کی ایک آڑھت کی دکان کا نام
ہے جس میں اسلام دین اور مذہب کی خرید وفروخت کا کاروبار ہوتا ہے
اور اس میں حصہ لینے والے بڑے بڑے نام نہاد علماء مفکروں دانشوروں
صحافیوں۔ ادیبوں اور شاعروں کو پیٹ کا جہنم بھرنے کے لئے معقول رقم
دی جاتی ہے اور اس کے عوض اشتراکیت کے مقابلہ کا نام دیکر دراصل اسلام
اور مسلمانوں کے خلاف ایسے ڈرامائی انداز میں مضامین لکھوائے جاتے
ہیں کہ قارئین پس منظر کی گہری سازش کو محسوس بھی نہ کرسکیں۔
حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے جنیوا کے اس فتنہ کی نشاندہی کرتے
ہوئے ایک عرصہ پہلے ٹھیک فرمایا تھا ؎

تری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!
سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے

یہ خط بھی اسی مذموم سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس خط کے آخری
مندرجات پر بھی غور کریجئے۔

"عرب قوم بڑی مسکین ہے اور عرب فوج اس سے بھی مسکین تر،

ذلیل و کمزور اور بے روح ۔"

اسلام اور مسلمانوں کی توہین اور تذلیل ——— ؟ اور پھر اسلام کے علمبرداروں کے ہاتھوں ۔ ؟ کیا مودودی صاحب کے پیروکار اور جماعت اسلامی کے کارکن یہی الفاظ اپنے لئے برداشت کریں گے ۔ ؟

عرب قوم اور عرب فوج — کو اس سے بڑی گالی اور کیا دی جا سکتی ہے اور ان کی ذلت و اہانت کے سلسلہ میں اس سے زیادہ قابل اعتراض جملے اور کیا استعمال کئے جا سکتے ہیں ؟

جماعت اسلامی کے ترجمان نے عربوں کی ذلت اور اہانت کے لئے جو زبان استعمال کی ہے وہ "ہز ماسٹرز وائس" کے درجہ میں ہے کیوں کہ امریکی رسالہ ٹائم نے بھی وہی لب و لہجہ اختیار کیا ہے ۔ چنانچہ درج ذیل اقتباس سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکیں گے کہ ان دونوں کی سُریں کس طرح آپس میں ملی ہوئی ہیں

امریکی رسالہ ٹائم مورخہ ۱۴ ر جولائی ۱۹۶۷ء نے

خود فریب جزیرہ عرب " خود فریبی میں مبتلا لوگ " کے زیر عنوان لکھا ہے ۔

مبالغہ آرائی عربوں کا سب سے بڑا آرٹ ہے ، پیغمبر نے اگرچہ شراب نوشی منع کی ہے لیکن عرب اکثر " الفاظ " کے نشہ میں بدمست ہوتے ہیں اور لکھا ہے کہ

عرب کی ترقی میں رکاوٹ کا بڑا سبب اسلام باقی رہ گیا ہے ۔

ترکی نے تو اسلام سے نجات حاصل کر لی ہے لیکن عرب ابھی تک

اسلام کی لعنت سے چھٹکارا نہیں پا سکے ہیں۔ بہت سے عرب عدن سے الجزائر تک غریب، بیمار، جاہل اور بیسویں صدی میں زندہ رہنے کی ناکام کوشش کی احتیاج میں ہیں۔

مصری حقیقتاً عرب نہیں اگرچہ وہ عرب کہلائے جاتے ہیں وہ حام کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ مسکین، تابعدار، دریائے نیل کی آب و ہوا اور بیماریوں کے باعث نہایت لاغر اور کمزور ہو چکے ہیں۔ انہوں نے تاریخ میں شاید ہی کوئی جنگ جیتی ہو،"

عربوں کو ذلیل "کمزور" اور "بے روح" کہہ کر گالیاں دی جا رہی ہیں اور امریکی رسالہ ٹائم نے عربوں کی تذلیل اور اہانت کے لئے جو زبان استعمال کی ہے وہی الفاظ اور وہی جملے جماعت اسلامی کے اخبارات استعمال کر رہے ہیں امریکی مفادات کی نیابت کا اس سے گھناؤنا اور مکروہ کردار ادا کیا ہو سکتا ہے۔

اگر عرب باشندے "سب و شتم" کرنے والوں کے خلاف بھی اسی نوعیت کا تلخ اور درشت لب و لہجہ اختیار کریں تو کہا جائے گا۔ دیکھئے — عرب ہمیں برا بھلا کہہ رہے ہیں۔

عربوں اور ناصر کے خلاف یہ مہم (یہود و نصاریٰ) کو فائدہ پہنچانے ان کی ترجمانی کے فرائض سرانجام دینے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے سوا اور کس لیئے ہے۔ ؟ بہت بڑا توشہ آخرت ہے۔ جو ان لوگوں نے اپنے لئے تیار کیا ہے۔ پھر "جنیوا" کے مکتوب نگار کی تحریر شائع کرتے

ہوئے جماعت اسلامی کے ترجمان ایشیا نے صرف مغربی اخبارات کے
حوالہ سے مصری فوج اور یہودی سپاہیوں کا موازنہ کرتے ہوئے مندرجہ بالا
عبارت میں جو کچھ تحریر فرمایا تھا اس میں مصری فوج کے افسروں کو عیش اور
تنعم میں غرق ظاہر کیا گیا ہے۔ عام سپاہیوں کو درماندہ اور لاغر و نحیف
بتلایا گیا ہے۔ یہودی سپاہیوں کی توصیف اور ان کے محاسن بیان کرتے
وقت انہیں کوئی خیال نہ آیا ـــ کہ جن دنوں یہود و نصاریٰ
قبلہ اول پر قبضہ جمانے کے بعد مدینہ طیبہ کی جانب نگاہ بد اٹھائے گئے
مذموم ارادے رکھتے ہوں۔ اہل اسلام کا سینہ گولیوں سے چھلنی کر رہے
ہوں۔ مسلمان عورتوں کی بے حرمتی کر رہے ہوں اور معصوم بچوں کو نوک سنگین
پر اچھال رہے ہوں۔ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے والے لوگ عین زمانہ جہاد
میں یہودیوں کی قوت اور طاقت اور ان کی "بہادری" کی داستانیں سنائیں
اسلام اور مسلمانوں کے مفادات کے ساتھ اس سے بڑی غداری اور کیا
ہو سکتی ہے اور منافقت کا اس سے گھناؤنا کردار اور کیا ہو سکتا ہے؟

اسلام نے تو ہر مسلمان کو خواہ وہ دنیا کے کسی بھی حصے کا رہنے والا ہو
.. یہ تعلیم دی ہے کہ "ایام حج" میں بیت اللہ کا طواف کرتے
وقت خوب اکڑ کر چلے۔ اور اگر ضعیف العمری ناتوانی کے باعث
اس طرح چلنے سے معذور رہے تو کم از کم چلنے میں اپنے شانے اور
بازو اس طرح ہلائے گویا وہ اکڑ کر چلنے کی کیفیات کا مظاہرہ کر
رہا ہے۔

یہ تربیت اس لئے دی گئی ہے تاکہ کفار کے دلوں پر اہل اسلام کی قوت و شوکت کا رعب چھا جائے۔ اور مسلمانوں کی زندگی کا کوئی کمزور پہلو انکے سامنے نہ آسکے۔ کیا جماعت اسلامی کے امیر جناب مودودی صاحب اور ان کے صالح مدیران جرائد اسلامی تعلیمات کے اس پہلو پر نگاہ ڈالنے کی زحمت گوارا کریں گے ؟ کہ وہ عربوں اور رقاصوں کے خلاف گمراہکن پروپیگنڈے سے کس کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔ اور وہ کس کے اشارہ ابرو پر رقص کر رہے ہیں ؟

کیا ان حضرات کو نہیں معلوم ـــــ کہ حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے باہمی تصادم کے موقع پر جب ایک عیسائی بادشاہ نے حضرت امیر معاویہؓ کو پیشکش کی تھی۔ کہ حضرت علیؓ کے خلاف محاذ قائم کرنے میں وہ انکی خاص امداد کر سکتے ہیں۔ تو حضرت امیر معاویہؓ نے اسے ڈانٹ پلاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

او ـ رومی کتے ـ! کیا تو ہمارے اس باہمی تصادم سے خوش ہوتا ہے۔ یاد رکھ ! اگر تو نے حضرت علیؓ کی ذات یا ان کے ساتھیوں کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی دیکھا تو تیری آنکھ نکال دی جائے گی۔ اور اگر ان کی جانب انگلی کا اشارہ بھی کیا تو اسے قلم کر دیا جائے گا۔ اور میں پہلا شخص ہوں گا جو حضرت علیؓ کی عزت اور آبرو بچانے کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ بہانے سے دریغ نہ کرے گا۔

خود شاہ فیصل نے بھی اپنے دورہ امریکہ کے دوران بعینہٖ اسی قسم کا جواب دیا تھا۔ جب ان سے دریافت کیا گیا تھا۔ کہ اگر اسرائیل مصر پر حملہ کرے تو تمہاری حیثیت کیا ہو گی۔ شاہ فیصل نے برملا کہا تھا۔ کہ

یمن کے مسئلہ میں ناصر سے اختلاف کا یہ معنیٰ نہیں کہ میں یہودیوں کا آلہ کار بن کر ناصر سے اختلاف کروں گا۔ اگر یہودیوں نے مصر یا کسی دوسرے ملک پر حملہ کیا تو میری خدمات ناصر کے سپرد ہوں گی۔

اسی طرح ناصر سے جب ایک اخبار نویس نے دریافت کیا کہ یمن کے بارے میں سعودی عرب سے اختلافات کی موجودگی میں اگر اسرائیل سعودی عرب پر حملہ کر دے تو آپ کی پوزیشن کیا ہو گی تو صدر ناصر نے اپنے روایتی لہجہ میں زوردار الفاظ میں جواب دیا۔

"یہ مسئلہ دو بھائیوں کا اپنا ہے۔ اور یہ ہمارا داخلی معاملہ ہے۔ ہم اسرائیل اور امریکی سامراج کے مقابلہ میں بنیانٌ مرصوص ہوں گے۔ اور یہ عارضی اختلافات، سامراجیوں کے ناپاک عزائم کی تکمیل کا ہرگز ہرگز باعث نہ بن سکیں گے"

جب عرب سربراہانِ مملکت اپنے ذاتی اختلافات کے بارے میں اس طرح کے مخلصانہ جذبات رکھتے ہوں اور غیروں کے مقابلہ میں اپنے ذاتی اختلافات کو پسِ پشت ڈال کر اپنی تمام تر توجہ اور اپنے تمام تر وسائل دشمن کے مقابلہ اور اسے دندان شکن جواب دینے پر مرکوز رکھ سکتے ہوں تو

کیا وجہ ہے کہ پاکستان کے بعض اخبارات و رسائل اور بالخصوص جماعت
اسلامی نے اپنے ترکش کے زہریلے تیروں سے اسلامیان عرب کے دل
چھلنی کرنے کے لئے باقاعدہ محاذ قائم کر رکھا ہے انہیں ذلیل وخوار کرنے
اور ان کے زخموں پر ہمدردی وغمخواری کا مرہم رکھنے کی بجائے ان کے
زخموں پر نمک پاشی کی جا رہی ہے اور جو کام امریکی اور اسرائیلی سامراج
انجام نہ دے سکتا تھا وہ خود مسلمانوں کے ہاتھوں پورا کیا جا رہا ہے جس
کا نتیجہ یہ ہے کہ عوام الناس کے دلوں میں عربوں کے خلاف زہریلے
پروپیگنڈے کا گہرا اثر ہو رہا ہے ان کے دلوں میں عربوں کے لئے جذبات
ہمدردی کی بجائے نفرت وحقارت گھر کر رہی ہے اور اسلام کے حقیقی
دشمنوں (امریکہ، برطانیہ اور اسرائیل) سے توجہ ہٹ کر عربوں کے عمل و کردار
ان کی شکست کے اسباب اور ان کی خامیوں اور کمزوریوں پر مرکوز ہو رہی
ہے۔ عیار دشمن یہی چاہتا ہے کہ عربوں سے باہر کی دنیا ان سے متنفر
ہو جائے اور ———— یہاں پر انہیں بے کسی اور بے یار ومددگار
کی حالت میں نیست ونابود کر دیا جائے۔ ؎
بیس از کرمی بریدی دہاکے پوستی

قاہرہ اور تل ابیب

ایک موازنہ

قاہرہ اور تل ابیب کا موازنہ کرتے ہوئے یہ دیکھا جا رہا ہے کہ مصر میں نہ خدا ہے نہ اسلام اور ادھر یہودی خدا کا نام بھی لیتے ہیں اور تورات بھی پڑھتے ہیں۔

چنانچہ جماعت اسلامی کے ترجمان ہفت روزہ ایشیاء نے

"قاہرہ اور تل ابیب"

"دو عبرت انگیز تصویریں" کے زیر عنوان لکھا ہے۔

مولانا! اتنی ذلت آمیز اور سبق آموز شکست اس امت کو کبھی نہیں ہوئی میرے ایک دوست کو یہاں ۸، ۹ جون کو لندن سے ۴ جون کا خط لکھا ہوا اُن کے ایک دوست کا ملا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ قاہرہ اور تل ابیب میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ یہاں ہم لوگ ٹیلویژن پر دیکھ رہے ہیں۔

قاہرہ کے کسی نعرے میں اور کسی جھنڈے پر اسلام کا کوئی تذکرہ

نہیں ہے۔ صرف جاہلیت جدیدہ والے نعرے ہیں اور وہی مناظر ہیں
اور اس کے برعکس تل ابیب میں "عام روزہ" ہے۔ یہودی تورات
ہاتھ میں لئے اللہ سے دعائیں مانگ رہے ہیں۔ لکھنے والے نے آگے
لکھا تھا۔ کہ ان مناظر کو دیکھ کر ڈر لگ رہا ہے کہ کیا ہوگا۔

صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح کبھی کبھی نصرت کھلے طور
پر معجزانہ انداز میں آتی تھی۔ اسی طرح اس معرکے میں "خذلان"
معجزے کے طور پر آیا۔

(ایشیاء لاہور ۱۶ رجولائی ۱۹۶۷ء)

مندرجہ بالا اقتباس پورے غور و فکر اور خصوصی توجہ کا محتاج ہے۔
سوال یہ ہے کہ جب اسرائیلی جارحیت کے ابتدائی مرحلہ میں ہی سرزمین
مصر سے تمام خبر رساں ایجنسیوں کے نمائندوں اور اخباری نامہ نگاروں
کو نکال باہر کیا گیا تھا۔ اور دوران جنگ انہوں نے تل ابیب کو اپنا مرکز بنا لیا
تھا۔ تو مصری عوام کے "روزے" ان کی "نمازیں" اور ان کی "تلاوت قرآن"
کو لندن کے ٹیلی ویژن اسٹیشنوں کے لئے ٹیلی وائز کرنے والا کون تھا
اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیں کہ خبریں اسمگل ہو کر جاتی رہیں یا تل ابیب کا
ریڈیو اور ٹیلی ویژن اسٹیشن قاہرہ سے سب کچھ نقل کر کے لندن اور دوسرے
شہروں میں بھجوا رہا تھا۔ تو ان مغربی خبر رساں ایجنسیوں اور لندن ٹیلیویژن
اسٹیشن کے ارباب اختیار کو اس بات کا غم کیوں کھائے جا رہا ہے۔ کہ

مصری جھنڈے پر اسلام کا نام نہیں ہے اور وہاں کے عوام نہ روزہ رکھ رہے ہیں۔ نہ ہاتھوں پر قرآن رکھ کر دعائیں مانگ رہے ہیں۔ آخر ان کی نظر بندی کا پس منظر کیا ہے؟ اور پھر مغربی خبر رساں ایجنسیوں کا "قابلِ نمائندہ" وہ کون تھا جس نے پوری خلا ترسی اور شانِ تواضع کے ساتھ تل ابیب اور قاہرہ کے باشندوں کا دینی لحاظ سے موازنہ کر کے درد بھرے انداز میں یہ پہلو ٹیلی وائز کیا کہ مصری عوام "جاہلیت جدیدہ" کے نعرے لگا رہے تھے اور تل ابیب کے یہودیوں کے "روزے" رکھنے کی تمام ترکیفیات عالم محسوسات میں دیکھ رہے ہیں۔ لوگ "تورات" ہاتھ میں لئے اللہ سے دعائیں کرتے تو نظروں سے دیکھے جا رہے ہیں۔ یہ روزہ رکھنے کی اطلاع ٹیلی ویژن پر کس طرح دی گئی ہے۔ ؟ ایسی بے سروپا باتوں کی تشریح کرنے والوں کے دلوں میں ذرہ برابر بھی خوفِ خدا اور آخرت میں ان باتوں کی جواب دہی کا احساس ہوتا تو شاید وہ جھوٹ اور افترا پردازی کی اس واضح بات کو زبان پر لانے اور اس کی تشہیر کرنے سے ضرور گریز کرتے۔ کیا ان لوگوں کی نگاہوں سے حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان اوجھل ہو گیا ہے۔

كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ

(او کما قال علیہ السلام)

کسی آدمی کے جھوٹا اور کذاب ہونے کے لئے بس اتنا ہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بلا تحقیق و تجسّس ہر کسی کے سامنے بیان کر دے۔

کیا یہ حضرات بتا سکتے ہیں کہ "لندن" کے وہ دوست کون تھے۔ جنہوں

نے یہود و انصاری کے جھوٹے پروپیگنڈے کی پوری تحقیق اور اطمینان کرنے کے بعد ایسا خطرناک بیان زبان پر لانے کی زحمت اٹھائی ہے جس میں ایک علاقہ کے تمام مسلمان باشندوں کو (نعوذ باللہ) قرآن۔ اسلام۔ روزے اور دعاؤں سے منکر واضح کیا گیا ہے اور اس کے مدمقابل یہودیوں کو خدا تعالیٰ کا مطیع و فرمانبردار ثابت کرنے کے لئے انہیں روزہ دار اور متبع تورات ظاہر کیا گیا ہے۔

کیا یہ بزرگ اس بات کی بھی وضاحت فرما سکتے ہیں کہ یہودی روزہ دار کی حیثیت سے جس کتاب کو اٹھا کر دعائیں مانگ رہے تھے۔ اُس کے "تورات" ہونے کا ثبوت انہیں لندن کے کس صاحب نے فراہم کیا ہے؟ اور کیا انہیں صرف مصری جھنڈے پر ہی اسلام نظر نہیں آتا یا اور بھی کچھ اسلامی ملک ایسے ہیں۔ جنکے جھنڈوں پر اسلام کا نام تحریر نہیں ہے۔ اور کیا وہ دنیائے اسلام کے مجوزہ جھنڈوں کی صرف اسلام کی تحریر نہ ہونے کے سبب کفار کے جھنڈے سمجھتے ہیں ۔ اور کیا وہ یہ بات ثابت کر سکتے ہیں کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے پر اسلام کا نام۔ کلمہ طیبہ یا قرآن مجید کی کوئی آیت تحریر تھی ۔؟ جب خود رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جھنڈا صرف کالی اور سفید دھاریوں پر مشتمل تھا۔ اور علم نبوی میں کوئی تحریر موجود نہیں تھی۔ تو پھر مصر، شام، ایران، عراق اور پاکستان کے جھنڈوں کو کس طرح غیر اسلامی کہا جاتا ہے ۔؟ اور ۱۹۶۵ء میں جبکہ بھارت نے کسی اعلان کے بغیر پاکستان پر تردلانہ حملہ کیا تھا۔ اور ان دنوں اللہ تعالیٰ نے بھارت کے

مقابلہ میں پاکستان کو فتح و نصرت عطا فرمائی تھی تو اس وقت پاکستانی جھنڈے پر کلمہ طیبہ یا اسلام کا نام تحریر کر دیا گیا تھا؟ ان بزرگوں نے جھنڈے پر "اسلام" کی تحریر کو فتح و شکست کا کس طرح مدار قرار دے لیا ہے۔؟

اور پھر ان بزرگوں کا انکشاف حیرت انگیز اور ناقابل فہم ہے کہ خدا کی نصرت اور امداد کے ساتھ انہوں نے "خذلان" یعنی مسلمانوں کی ذلت اور رسوائی کو بھی معجزہ قرار دیا ہے۔

گویا ان حضرات کو مصر اور عربوں کے "خذلان" ان کی شکست، انکی ذلت و رسوائی" کا قطعاً یقین نہ تھا — یہ تو خدائی معجزہ ہوا کہ مصر اور عربوں کو "خذلان" نصیب ہو گیا اور حاسدین کی جان میں جان آئی۔

خط کی تشہیر کیوں؟

فرض کر لیجئے — کہ لندن کے مکتوب نگار نے عربوں کے بارے میں جو قیمتی معلومات فراہم کی ہیں۔ وہ سرتاپا مبنی بر صداقت ہیں اور انکی صحت و صداقت کے بارے میں ذرہ برابر شک اور عدم اطمینان کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور تسلیم کہ یہ حیرت انگیز صداقت ٹیلی وائز کرتے وقت پوری خدا خوفی، اور فکر آخرت کو ملحوظ رکھا گیا تھا۔ سوال صرف یہ ہے کہ ایک نجی خط (اور وہ بھی غیر معروف آدمی کا کسی غیر معروف آدمی کے نام) کو بھارت سے بغرض اشاعت پاکستان میں امپورٹ کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔!

اور پھر نہایت اہتمام کے ساتھ پاکستانی اخبارات و رسائل میں نمایاں جو کھٹوں میں شائع کرنے کی آخر کون سی مصلحتیں اور مجبوریاں ہیں۔ جن سے دامن بچانے

کوشش نا ممکنات میں سے تھی۔

کیا انہوں نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا فرمائی کہ اس طرح کے نجی خطوط شائع کر کے وہ اہل اسلام کے دل و دماغ پر یہودیوں کی مذہبی برتری کے نقوش ثبت کر رہے ہیں اور اہل اسلام کو تارک صوم، تارک قرآن اور اسلام سے منحرف ثابت کرنے کی سعی مذموم کر رہے ہیں، اور اگر یہ سہواً نہیں عمداً کیا ہے۔ تو اسکی تشہیر سے کیسے فائدہ پہنچانا مقصود ہے؟ اور کیا ان حضرات کے خیال مبارک میں جھنڈے پر اسلام کے الفاظ کے وجود اور عدم وجود کی بحث کا یہی موزوں وقت ہے جیسا کہ اندلسی عیسائی : وہ مسیح علیہ السلام کا پیشاب پاک ہے یا ناپاک۔ کے عنوان پر مناظرہ بازی کرتے رہے اور اہل اسلام کو غلبہ نصیب ہو گیا۔ یعنی آج مسلمان غیر کی فراہم کردہ معلومات پر

ہیں مسلمانوں کے درمیان نفرت و حقارت کی خلیج حائل کرتے رہیں۔ اور دشمن ہماری اس بے وقت سر پھٹول سے ناجائز فائدہ اٹھا کر بیت المقدس کے بعد نہر سویز، مدینہ طیبہ اور مکہ معظمہ حتیٰ کہ سارے جزیرہ عرب پر قبضہ و تصرف جمانے پر نظریں جمائے بیٹھا ہو اور ہم باہم گردست و گریبان ہو رہے ہوں۔

یہ وقت قاہرہ اور تل ابیب، مسلمان اور یہود کے تقابل اور موازنے کا نہیں بلکہ اہل اسلام کے درمیان وحدت و یگانگت اور اتحاد و اتفاق قائم کرنے اور ان کی عزت و عظمت دوبالا کرنے کا ہے

ناصر اور اخوان المسلمین

صدر جمال عبدالناصر کے خلاف سب سے زیادہ منافرت انگیز پروپیگنڈا یہ کیا جا رہا ہے کہ مصر میں اسلام کا نام لینے والی ایک ہی جماعت تھی "اخوان المسلمین" چونکہ اس کے رہنماؤں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا ہے اس لئے اب مصر میں اسلام کا کوئی نام لیوا موجود نہیں ہے۔

جماعت اسلامی پاکستان کے امیر جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے رسالہ "ترجمان القرآن" کا ادارتی نوٹ ملاحظہ فرمائیے۔!

"لیکن ناصر صاحب نے اشتراکیت کی اندھی محبت میں آنکھیں بند کر کے اس زبردست اسلامی تحریک کو بڑے جبر و استبداد کے ساتھ برباد کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف مصر میں بلکہ دوسرے عرب ملکوں میں

بھی کوئی گروہ ایسا باقی نہ رہا جو اس جنگ کے موقع پر اپنی قوم میں جذبہ دجوش ابھارتا اور روح جہاد بیدار کرتا۔ غضب یہ ہے کہ نہ جنگ سے پہلے اخوان کو رہا کیا گیا نہ جنگ کے زمانے میں اور نہ جنگ کے بعد۔"

(ترجمان القرآن ماہ جولائی ۱۹۶۷ء)

اخوان المسلمین مصر کی ایک ایسی جماعت تھی جس نے اپنے مرحلۂ آغاز میں اسلامی مطبوعات کی اشاعت میں جماعت اسلامی کی طرح بڑا نام پیدا کیا تھا اس جماعت کے بانی سید حسن البنا ایک مخلص انسان اور اسلام کی دعوت و تبلیغ کے زبردست مبلغ اور داعی تھے) جنہیں بعض حاسدوں نے ذاتی رنجش اور دشمنی کی بنا پر گولی مار کر شہید کر دیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد شاہ فاروق کے محروم اقتدار ہونے تک اخوان المسلین کے لیڈر مصری عوام کی دینی اور سیاسی راہنمائی کے فرائض نہائیت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اخوان مصر کی زبردست فعال جماعت بن گئی تھی مصر سے ملوکیت کے خاتمے کے لئے اخوان المسلمین کی خدمات آب زر سے لکھنے کے لائق ہیں۔ اور مصر کا کوئی مؤرخ اخوان کی یہ خدمات ہرگز فراموش نہیں کر سکتا۔

لیکن شاہ فاروق کے بعد جب انقلابی برسر اقتدار آئے تو انقلابی کونسل کے اراکین جنرل محمد نجیب (صدر) اور کرنل جمال عبدالناصر (وزیر اعظم) نے مختلف جماعتوں اور حلقوں کو حکومت میں نمائندگی دیتے ہوئے اخوان المسلمین کو بھی وزارت میں شمولیت کی دعوت دی اور اخوان سے ان تین وزیروں

ے نام طلب کئے جنہیں کابینہ میں شامل کیا جانا مقصود تھا۔ لیکن وزارت کے مسئلہ پر "اخوان المسلمین" باہمی اختلافات کا شکار ہو گئی۔ اور جماعت نے جن تین افراد کا نام تجویز کیا تھا۔ ان میں صرف ایک شخص .....

.... وزارت میں شامل ہونے پر آمادہ ہوا ——

اس اختلاف کا نتیجہ یہ نکلا جماعت دو گروہوں میں بٹ گئی۔ ایک گروہ انقلابیوں (حکومت) کا حامی تھا اور دوسرا مخالف — !

ملوکیت اور بادشاہت کے استبداد سے مصری عوام کو چونکہ تازہ تازہ نجات ملی تھی۔ اس لئے مغربی طاقتوں (برطانیہ اور امریکہ) کی ساری توجہ اسی آئی ہے) کے ذریعہ مصر میں ریشہ دوانیوں، گہری سازشوں اور اپنا اثر و نفوذ بحال کرنے پر مرکوز ہو گئی۔ برسر اقتدار افراد کے مقابلہ میں حزب اختلاف سے دشمنی کی بنا پر چونکہ آسانی کے ساتھ رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ اور مخالفانہ جذبات کو ہوا دے کر بہت سے مفید مطلب کام نکالے جا سکتے ہیں۔ اس لئے اخوان کے بعض لیڈر اور کارکن دانستہ اور نادانستہ طور سے سامراج کے آلہ کار بن گئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اخوان کے بعض رہنما اور کارکن نہایت مخلص اور اپنے مشن میں پوری خدا خوفی سے کام کر رہے تھے۔ لیکن جماعتوں میں سب افراد یکساں طور پر دیانت دار نہیں ہوتے۔ ان کے مزاج ان کا انداز فکر اور طرز کارکردگی ایک دوسرے سے مختلف اور جُداگانہ ہوا کرتا ہے۔

اخوان المسلمین میں بھی کچھ لوگ ایسے تھے جو اعتدال، تحمل اور برداشت

سے کام لینے کی بجائے اکھڑ، جذباتی، اور تند مزاج واقع ہوئے تھے۔
جن میں سے ایک اخوانی لیڈر سید قطب بھی تھے جن کی دینی اور علمی
عظمت کا خوب خوب پرچار کرتے ہوئے انہیں دنیائے اسلام کا سب سے
بڑا عالم دین بیان کیا جاتا ہے۔ ہمیں انکی سب باتوں سے اختلاف نہیں
انہوں نے دیگر جلیل القدر اخوانی رہنماؤں کی طرح اچھے کام بھی کئے ہیں
لیکن زندگی کے آخری ایام میں انہوں نے ایک کتاب
العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام " (اس کتاب کا اردو ترجمہ
"اسلام کا نظام عدل" کے نام سے لاہور سے شائع ہو چکا ہے) لکھ کر
خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اور بالخصوص حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ
اور حضرت ابو سفیان اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہم کی شان میں
ایسی گستاخانہ جسارت کی ہے۔ جو ان کے نامۂ اعمال کو سیاہ کرنے کے لئے
کافی ہے۔

اس کتاب کی اشاعت پر سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کے ترجمان
القرآن میں نئی مصری مطبوعات کے زیر عنوان مخالفانہ تبصرہ شائع ہوا تھا
۔ اس کے مطالعہ سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکیں گے کہ سید قطب اپنے
مزاج، انداز فکر اور طرز عمل کے اعتبار سے کیسے شخص تھے اور انکے مخالف
صدر ناصر نے جن مجبوریوں کے تحت انتہائی قدم اٹھایا وہ کیا تھیں؟
سید قطب صاحب کی مذکورہ تصنیف (اسلام کا نظام عدل) پر تبصرہ
کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"سید قطب جامعہ فواد کے گریجویٹ، "امریکا بلیپٹ" اور مصر کے نئے لکھنے والوں میں امتیاز و شہرت کے مالک ہیں۔ الاخوان المسلمون یا کسی اور مذہبی انجمن سے ان کا کوئی باضابطہ تعلق نہیں۔ اسلام کی تعلیمات نے خود انہیں اپنی طرف کھینچا اور آہستہ آہستہ یہ حقیقی اسلام کے مبلغ اور اسلامی تحریک کے داعی بن گئے لیکن چونکہ ان کا یہ جوش و خروش کسی مدرسہ یا دار العلوم کا مرہون منت نہیں ہے اور نہ ان کے دل میں علماء کرام کا کوئی روایتی احترام ہی ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر خامیوں اور غلطیوں پر تنقید سخت اور تلخ ہوتی ہے"! اس سے آگے لکھا ہے۔!

ساتواں باب اسلام کی تاریخ سے چند مثالیں کتاب کا سب سے طویل اور اہم باب ہے۔ اس میں مؤلف نے اسلام کی تاریخ اور فکری تغیرات کا جائزہ لیا ہے اور شیخین (ابوبکرؓ و عمرؓ) کے عہد خلافت سے لیکر دور حاضر تک کی فکری اور عملی تبدیلیوں پر نظر ڈالی ہے۔ مصنف نے جائزے میں لگی لپٹی نہیں رکھی جو کوئی اسلامی روح کا پیکر اور اسکی اصلی خصوصیات کا حامل نظر آیا۔ اس کے حق میں کلمہ خیر سے بخل نہیں کیا گیا۔ اور جو اس راہ سے ہٹا ہوا دکھائی دیا۔ اس پہ نقد کرنے میں کوئی

جھجک نہیں محسوس ہوئی۔

جدید تعلیم اور جوشِ جوانی کے باعث اُنکا قلم روائتی احترام وعقیدت کا بھی شرمندہ احسان نہیں۔ اس لئے قدرتی طور پر بنو اُمیہ اور خاص کر امیر معاویہ پر سخت اور تلخ لہجے میں تنقید کی ہے۔ ان کے خیال میں معاویہ پہلے شخص ہیں۔ جنہوں نے اسلامی سیاست سے اخلاق کا عنصر خارج کرنے کی کوشش کی۔ ابوسفیان اور ھندہ کا اسلام بھی مصنف کے نزدیک مجبوری کے اقرار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اور تو اور حضرت عثمان رضی بھی مصنف کی تلخ بیانی سے نہیں بچ سکے ہیں انکی کوتاہیوں کیلئے عذر تلاش کرنیکی کوشش کی ہے۔ مگر معاف کرنے کے لیے تیار نہیں سید قطب کی اس کتاب کے متعلق ترجمان القرآن کے صفحہ ۳۸ کے حاشیہ میں یہ وضاحت درج ہے۔

لے ہمارے نزدیک اس وقت کتاب کا دوسرا منقح ایڈیشن ہے جو مصنف نے پچھلے دنوں امریکہ سے واپسی پر شائع کیا ہے۔ پہلا ایڈیشن بغداد میں راقم کی نظر سے گذر چکا تھا۔ اس ایڈیشن میں مفید اضافے ہیں امریکہ کی ایک علمی سوسائٹی اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کر رہی ہے (ترجمان القرآن اکتوبر ۱۹۵۶ء)

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے اسم گرامی پر انہوں نے کسی جگہ (رضہ) کا نشان بھی نہیں لکھا

سید قطب کی ذات مزاج اور اس کے جذباتی انداز فکر سے شناسائی حاصل کرنے کے لئے خود جماعت اسلامی کے ترجمان کی مندرجہ بالا عبارت اور بالخصوص خط کشیدہ تحریر ہی کافی ہے ۔ اس سے صاف واضح ہو گیا کہ سید قطب" امریکہ" کا تربیت یافتہ جذباتی اور گستاخ شخص تھا ۔ اور اسلام سے متعلق اس کی معلومات ۔ زیادہ تر امریکی دانش گاہوں کی مرہون منت تھیں ۔ ترجمان القرآن کے اس تبصرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ

۱۔ سید قطب مزاجاً سخت تھا۔

۲۔ دوسروں کے اعمال کو اپنے مخصوص عقائد کے ترازو میں تول کر ان پر گستاخانہ تنقید کرتا تھا ۔ اور جوشش جوانی کے باعث ان کا قلم روائتی ۔ عقیدت و احترام کا بھی قدر شناس نہ تھا۔

۳۔ اسکی تنقید کے تیروں سے جلیل القدر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ذوات گرامی بھی محفوظ نہ رہ سکی تھیں۔

۴۔ وہ اپنے مخصوص عقائد کی وجہ سے بعض صحابہ کرام (بالخصوص حضرت عثمان ذی النورین رض) کو ملت اسلامیہ کے زوال کی علامت قرار دیتا ہے اور انہیں کسی بھی قیمت پر معاف کرنے کو تیار نہیں۔

مندرجہ بالا صفات کا حامل شخص جس کی ذہنی تربیت امریکہ ایسے سامراجی ملک میں ہو اگر جمال عبدالناصر کی حکومت کا تختہ الٹنے، انہیں قتل کرنے اور پورے ملک کے نظام کو تشدد کے ذریعہ درہم برہم کرنے کے لئے کوئی اقدام کرے تو اس پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیئے

بہت کم لوگوں کو اس حقیقت کا علم ہوگا کہ سید قطب اس سے پہلے بھی کئی بار حکومت کے خلاف سازش میں ملوث پایا گیا تھا۔ لیکن صدر ناصر نے محض اسلامی رواداری سے کام لیتے ہوئے اسے ہر دفعہ معاف کر دیا۔ آخری بار جب اُسے عدالت نے موت کی سزا دی ہے تو امریکی حکومت نے اس کی رہائی کے لئے مصری حکومت پر کافی دباؤ ڈالا لیکن اب معاملہ چونکہ سنگین نوعیت اختیار کر گیا تھا اس لئے صدر ناصر نے امریکی دباؤ کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ اور عدالت کے فیصلے کو بحال رکھا۔

اسلام اور اخوان

جماعت اسلامی کے رسائل و جرائد اس پروپیگنڈے کے لئے وقف ہیں کہ مصر میں اسلام کی نام لیوا صرف اخوان پارٹی ہی تھی۔ اس کے کارکن جب پھانسی پر لٹکا دیئے گئے تو پورے مصر میں ہی نہیں بلکہ تمام عالم عرب میں اسلام کا نام لینے والا اور لوگوں میں جذبہ جہاد بیدار کرنے والا کوئی نہ رہا۔ چنانچہ جماعت اسلامی کے ترجمان القرآن کے بعض جملے خاص توجہ طلب ہیں۔

"اس زبردست اسلامی تحریک کو بڑے جبر و تشدد کے ساتھ برباد کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف مصر بلکہ دوسرے عرب ملکوں میں بھی کوئی گروہ ایسا باقی نہ رہا جو اس جنگ کے موقع پر اپنی قوم میں دینی جذبہ و جوش ابھارتا اور روح جہاد بیدار کرتا۔" (ترجمان القرآن ماہ جولائی ۱۹۶۷ء)

جماعت اسلامی اور اس کے امیر سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب نے اسلام کو اخوان المسلمین کے چند رہنماؤں اور کارکنوں کی ذات کے ساتھ کس طرح مختص کر دیا ہے اور جو مسلمان اخوان کی تنظیم سے باہر ہیں وہ جماعتی نظام میں عدم شمولیت کے باعث اسلام سے ہی محروم کر دیئے گئے ہیں؟

اخوان المسلمون کا دائرہ کار تو صرف مصر تک ہی محدود تھا اور ان کے ساتھ مصری حکمرانوں نے زیادتیاں کیں۔ لیکن اردن۔ سعودی عرب اور دوسرے عرب ملکوں سے اسلام کا نام لینے والے کیونکر غائب ہو گئے سعودی عرب اور اردن نے تو اخوان یا دیگر دین پسند جماعتوں اور علماء کرام کو تختۂ دار پر نہیں لٹکا دیا تھا۔ اور نہ ہی انہیں جیل خانوں میں بند کر کے ان کی آوازیں پسِ دیوارِ زنداں محبوس کر دی تھیں! صرف اخوان کے کارکنوں اور اس کے رہنماؤں کی ذات سے اسلام کو مختص کر دینے اور اسے ناصر کے خلاف پروپیگنڈے کی بنیاد قرار دینے کا پہلو ــــ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ یہ سب کچھ محض سامراجی طاقتوں کی رضا جوئی اور ان کے مفادات کی تکمیل کے لئے کیا جا رہا ہے۔ اور ــــ اگر پروپیگنڈے کی اس مہم کا پس منظر صرف "اہل اسلام" سے ہمدردی اور ظالموں کے خلاف کلمۂ حق بلند کرنا ہی ہے تو کیا وجہ ہے کہ ترکی کے عدنان مندریس کو پھانسی پر لٹکا دینے والوں کے خلاف کوئی آواز بلند نہ کی گئی جبکہ عدنان کی پارٹی ترکی میں عربی زبان کی ترویج، عربی زبان میں نماز اور اذان کی ادائیگی اور اسلام کے دیگر نظریات کے تحفظ کے لئے ساعی و کوشاں تھی۔

اسی سلسلہ میں انڈونیشیا کے انقلاب ستمبر کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا
ڈاکٹر عبدالرحیم سکارنو انڈونیشیا کی آزادی کے تحفظ کے لئے سامراجی ملکوں
سے علیحدگی اور عوامی جمہوریہ چین سے دوستانہ مراسم کا احیاء چاہتے تھے۔
ابھی انہوں نے ابتدائی اقدامات ہی کئے تھے کہ سی آئی اے کے ایجنٹ حرکت
میں آگئے اور ملک کے طول و عرض میں اسلام کے تحفظ کے نام پر ایسی خوفناک
تحریک چلائی گئی کہ ڈاکٹر سکارنو کے پانچ لاکھ سے زائد مسلمان حامیوں کو
کمیونسٹ قرار دیکر گولیوں کا نشانہ بنا دیا گیا۔ جلیل القدر علماء کرام گرفتار
کرکے جیلوں میں بند کر دیئے گئے اور دینی تعلیم و تربیت کے بیشتر اداروں
کو کمیونسٹ اڈے قرار دے کر بند کر دیا گیا۔ سامراجیوں کی آتش انتقام اس
پر بھی سرد نہ ہوئی اور انڈونیشیا کے وزیر خارجہ ڈاکٹر سوباندریو ایسے محب وطن
اور صحیح العقیدہ مسلمان کو جنہوں نے پاک بھارت جنگ میں اسلامی ہمدردی
کے جذبہ کے تحت پاکستان کی پوری بے باکی سے حمایت کی تھی ملک کا غدار
قرار دیکر سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا۔

پاکستان کے نقطۂ نظر سے ضروری تھا کہ اس مرحلہ پر انڈونیشیا کے
ان رہنماؤں کی سزاؤں کے خلاف احتجاج کیا جاتا لیکن افسوس ہے کہ
جماعت اسلامی کے مصلحین نے الٹا اپنے آقایان ولی نعمت کو خوش کرنے کے لئے
ڈاکٹر سکارنو اور ڈاکٹر سوباندریو کو ملحد اور بے دین بنا دیا اور اپنی جماعت کے
سرکاری آرگن ترجمان القرآن میں ایک طویل مقالہ تحریر کر کے امریکی
مفاد کی ترجمانی کا حق ادا کیا اور اس طرح آڑے وقت میں پاکستان کے
کام آنے والوں کے قتل کے محضر نامہ پر بالواسطہ دستخط ثبت کر دیئے۔

صدر ناصر کی اِسلام پسندی

سامراجی قوتیں زرِ کثیر خرچ کر کے اپنے ایجنٹوں اور نمک حراموں کی وساطت سے ——— متحدہ عرب جمہوریہ کے صدر جمال عبدالناصر کے خلاف ——— مسلسل یہ گمراہ کُن پروپیگنڈا کرا رہی ہیں کہ وہ اسلام پر نہ تو کوئی اعتقاد رکھتے ہیں اور نہ ہی اسے پسند کرتے ہیں۔ صدر ناصر کی مفروضہ بے دینی اور اسلام سے برگشتگی کو واضح کرنے کے لئے ایسے ایسے افسانے گھڑے جا رہے ہیں کہ خدا کی پناہ! ان میں سے ایک افسانوی شاہکار ملاحظہ فرمایئے۔

" اسوان بند کی تعمیر کے وقت ابو سمبل کا جو بُت دریا کے کنارے واقع

تھا اسے وہاں سے ہٹا کر جب دوسرے مقام پر نصب کیا جانے لگا تو اس کے پاؤں کے نیچے قرآن مجید اور مصری دستور کا نسخہ دفن کیا گیا۔"

کراچی کے بعض اخبارات میں جب یہ خبر نمایاں چوکھٹے میں شائع کرائی گئی تو مصری سفارت خانے کی طرف سے اخبارات کے نام اس کی تردید شائع کرنے کو کہا گیا۔ لیکن انگریزی اخبار ڈان کے سوا باقی تمام اخبارات نے اس کی اشاعت خلاف مصلحت سمجھ کر صرف نظر سے کام لیا۔

مصری سفارت خانے کی طرف سے اس قسم کی من گھڑت خبریں شائع کرانے والوں سے یہ دریافت کیا گیا کہ بتوں کے قدموں میں (نعوذ باللہ) قرآن مجید کا نسخہ دفن کرنے سے حکومت مصر کو روحانی اور مادی کیا فائدے پہنچ سکتے ہیں۔؟ اور اس طرح کے گستاخانہ اقدام سے مصر کے کن باشندوں کو خوش کرنا مقصود تھا؟ آخر اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اور اگر اس قسم کا پروپیگنڈا کرنے والے سچے ہیں۔ تو اس گستاخانہ اقدام کے موقع پر حکومت کے خلاف کوئی آواز کیوں نہ بلند ہوئی۔

صدر ناصر کی دینداری اور اسلام پسندی کے متعلق "صدر ناصر کا کلمۂ شہادت" کے زیر عنوان ہفت روزہ ندائے ملت لکھنؤ کی رائے ملاحظہ فرمائیے۔ جو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا محمد منظور نعمانی کی زیر نگرانی شائع ہوتا ہے مولانا سید ابو الحسن ندوی مشرق وسطی میں بے پناہ مقبولیت

اور شہرت کے مالک ہیں اور مدینہ یونیورسٹی کے رکن ہونے کی حیثیت سے
شاہ فیصل کے زبردست مداحوں میں شمار ہوتے ہیں - صدر ناصر کی دینداری
اور اسلام پسندی کے بارے میں ان کے ترجمان اخبار ندائے ملت کو بھی اعتراف
کرنا پڑا ہے درج ذیل تحریر سے اندازہ لگایئے کہ صدر ناصر کیا ہیں؟ اور ان
کے خلاف ڈھونڈ ڈھونڈ کر جو الزامات لگائے جا رہے ہیں ان کا پس منظر
کیا ہے اور اس قسم کی خبریں کس غیبی اشارے پر شائع کی جا رہی ہیں :-

" اس بات کو سب ہی تسلیم کرتے تھے کہ صدر جمال عبدالناصر دینی
انفرادی زندگی میں خاصے بھلے آدمی ہیں اور روزہ نماز کی
پابندی ہی نہیں کرتے بلکہ اسلام نے جن چیزوں سے روکا ہے
ان سے محترز رہتے ہیں شراب سے خاص پرہیز کرتے
ہیں چنانچہ ایک بار جب ماسکو میں روسی وزیراعظم خروشچیف کے
ساتھ سرکاری ضیافت میں بیٹھے، تو انہوں نے اپنے سامنے
سے شراب ہٹا دی خروشچیف نے وجہ دریافت کی اور صدر
ناصر کا جواب سن کر اپنی شراب بھی ہٹا کر کہا
" آج میں بھی مسلمان ہوں گا "

اسی طرح بل گراڈ کی بین ناوابستہ ممالک کانفرنس کے خاتمے پر جب
جام صحت پیا گیا تو سب ہاتھوں میں شراب کے گلاس تھے امریکی رسالے
لائف نے سربراہوں کی یہ تصویر شائع کر کے نیچے لکھا
" ناصر نے مسلمان ہونے کی حیثیت سے سنگترے کا رس پیا "

اس مختصر سے اقتباس سے پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ جہاں اپنوں نے، ناصر کے خلاف بہتان طرازی کو اپنا شعار بنایا وہاں غیروں نے ان کی دین داری اور اسلام سے سچی لگن کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے

اعلانِ حق | اب قاہرہ میں ان کی ایک اہم تقریر شائع کی گئی ہے جو انہوں نے ۲۵ فروری ۱۹۶۵ء کو اپنی پارلیمنٹ کے خفیہ اجلاس میں کی تھی اس تقریر سے پتہ چلتا ہے کہ صدر ناصر نے آخرکار اس مسئلہ پر اپنا ذہن صاف کرلیا ہے۔!

تقریر میں بڑا اہم حصہ اسلام اور کمیونزم سے مقابلہ کا ہے، صدر ناصر نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ سوشلزم مذہب کے خلاف ہے لیکن یہ بات اس لئے صحیح نہیں کہ مذہب خود انسان کے استحصال کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام نے زکوٰۃ، صدقہ اور خیرات کے ذریعے ہر آدمی کی آمدنی کا ایک حصہ ضرورت مندوں کو دینے کا حکم دیا ہے۔ اسلام کی تاریخ، اس کے قانون اور شریعت کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ کہ اسلام نے سماج میں ضرورت مندوں کا حصہ رسدی رکھا ہے اسلام اجتماعی انصاف کا علمبردار ہے۔

اس کے بعد صدر ناصر نے صاف صاف کہا۔

"یہ کہنا غلط ہے کہ مصر کمیونزم کی سمت جا رہا ہے کمیونزم مذاہب اور اسلام کو تسلیم نہیں کرتا جس پر مصریوں کا ایمان ہے۔

کیمونزم ایک خاص طبقہ کی آمریت کا نام ہے مصر اس پر تیار نہیں۔ کیمونزم تشدد کے ذریعے سرمایہ دار طبقہ کو ختم کرنے کا حامی ہے مصر تشدد پر یقین نہیں رکھتا۔ ان کا یہ کلمۂ شہادت انفرادی نہیں اجتماعی زندگی کے شعبوں میں بھی ان کے مسلمان ہونے کا اعلان ہے اور اسی لحاظ سے اس کا خیر مقدم کیا جانا چاہیئے۔

ندائے ملت لکھنؤ ۲۳ اپریل ۱۹۶۵ء

حمائیت اسلام

صدر جمال عبدالناصر جب پاکستان کے دورہ پر آئے تو انجمن حمائیت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں آپ نے عوام سے خطاب کیا تھا۔ کاش! انجمن حمائیت اسلام کی طرف سے وہ تقریر شائع کر دی جاتی تو دنیا پر حق واضح ہو جاتا۔!

انہوں نے عربی زبان میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا: مجھے خوشی ہے کہ حمائیت اسلام کے جلسہ میں شریک ہو کر آپ سے خطاب کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔ حمائیت اسلام کے سلسلہ میں آپ کی خدمات لائق تحسین ہیں اور ہم جو کچھ مصر میں کر رہے ہیں وہ بھی حمائیت اسلام ہی کے لئے ہے"۔

آپ نے دوران تقریر بڑے فخریہ لہجہ میں فرمایا تھا کہ

ہمیں اس پر فخر اور ناز ہے کہ مصر کو حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے فتح کیا تھا۔ اور خدا کے فضل و کرم سے اب بھی مصر پر اہل اسلام ہی کا

تسلط و اقتدار قائم ہے۔

صدر ناصر جب اقتدار پر فائز ہونے کے پہلے سال ہی حج بیت اللہ پر تشریف لے گئے تو آپ نے عالم اسلام کے اتحاد پر رائے زنی کرتے ہوئے اپنی تصنیف فلسفہ انقلاب میں لکھا تھا۔

"جب میں خانہ کعبہ کے سامنے کھڑا تھا تو میرا تصور اور خیال دنیا کے دور دراز گوشوں اور خطوں کا طواف کر رہا تھا۔ جہاں جہاں اسلام پہنچا ہے جب میرا خیال پاکستان کے دس کروڑ، انڈونیشیا کے آٹھ کروڑ، چین کے پانچ کروڑ اور مدد دس کے چار کروڑ اور ان کے سواد نیا کے چپے چپے اور گوشے میں پھیلے ہوئے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کی طرف جاتا ہے اور جب میں یہ سوچتا ہوں کہ یہ سارے ملک ایک ایمان کے رشتے میں جکڑے ہوئے ہیں تو مجھے اس زبردست قوت کا شدت سے احساس ہوتا ہے جن کا دوبرعمل آنا تمام دینی بھائیوں کے لامحدود قوت اور اساس کا ضامن ہو سکتا ہے آج وقت ہے کہ عالم اسلام کے مسلمان متحد اور ایک اسٹیج پر جمع ہو کر اپنی کھوئی ہوئی حشمت اور عزت کو سراہیں۔ اور یہ ثابت کریں کہ اسلامی قوت کسی کے سامنے اپنا سر خم نہیں کر سکتی!"

روزنامہ کوہستان لاہور ۱۱ جون ۱۹۶۰ء

غیرتِ اسلامی کا مظاہرہ

صدر جمال عبد الناصر کی غیرتِ ایمانی اور حُبِ نبوی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ مصر میں کوئی شخص خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی لکھتے یا شائع کرتے وقت ہمارے ہاں کی طرح (ؐ یا صلعم) کے اشارے سے کام نہیں لے سکتا اور اگر کوئی شخص حضور کے نام مبارک پر مکمل طور سے صلی اللہ علیہ وسلم نہ لکھے تو اسے مصری قانون کے تحت قید کی سزا دی جاتی ہے۔

۲۔ صدر ناصر چونکہ ایک سچے مسلمان ہیں اس لئے انہوں نے مصر میں کمیونسٹ پارٹی اور مرزائی جماعت کو خلاف قانون قرار دے۔ کہا ہے جن جماعتوں کا وجود ہی ناپید ہو وہاں اس کے افراد کے لئے پذیرائی کا سوال ہی عبث ہے البتہ یہ افسوسناک پہلو صرف سعودی عرب میں شاہ فیصل کے برسر اقتدار آنے کے بعد ضرور سامنے آیا ہے کہ امسال ۱۹۶۷ء کو حج کے بہانے ختم نبوت کے منکر، جہاد اور وحدت و مرکزیت اسلام کے مخالف مشہور مرزائی سر ظفر اللہ خاں اور اس کے چند حواری کسی خاص مشن کی تکمیل کے لئے ارض مقدس میں داخل ہو گئے اور اسلام کے مطابق اپنے سابقہ احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے حکومت سعودیہ نے نہ صرف یہ کہ ان قادیانیوں کو حرم پاک اور بیت اللہ میں داخل ہونے کی اجازت دی بلکہ چوہدری ظفر اللہ خاں کو شاہی مہمانِ خصوصی کی حیثیت میں رکھا اور منیٰ میں عالم اسلام کے جلیل القدر مسلم زعماء کے اعزاز میں دی گئی شاہی ضیافت میں چوہدری صاحب

کو بھی مدعو کیا گیا۔

یہ تو خدا بھلا کرے پاکستان کے باعزت اور باحمیت مسلم نوجوانوں کا جنہوں نے بروقت زبردست احتجاج کر کے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ چوہدری ظفر اللہ اس شاہی دعوت میں بحیثیت مسلم رہنما خطاب کرنے کی جسارت نہ کر سکا۔ اور حکومت سعودیہ نے زبردست ہنگامے اور گڑبڑ سے بچنے کے لئے اسے سرکاری حفاظت میں ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیا۔

پاکستان کے جلیل القدر عالم دین اور تبلیغی جماعت کے ایک ممتاز رہنما جناب .... بھی حج کے موقع پر سعودی عرب تشریف لے گئے تھے اس سلسلے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ دنیائے اسلام اور بالخصوص سعودی عرب ہی کے بعض علماء کرام اور دینی رہنماؤں نے وہاں کے وقت نبی انتہا ... اور دیگر اعلیٰ حکام سے رابطہ قائم کر کے منکر ختم نبوت چوہدری ظفر اللہ خاں کو حج کے بہانے حرم پاک میں داخل ہونے کی اجازت اور پھر شاہی مہمان کی حیثیت سے اس کے اعزاز و اکرام کی طرف توجہ دلائی تو سب نے ہی بے حد ... کا اظہار کیا اور پورے سعودی عرب میں کوئی رجل رشید بادشاہ سلامت کے دربار عالی وقار میں حاضری کا دم بھرنے کی جرأت نہ کر سکا۔

اگر کسی انسان کی آنکھوں پر تعصب، ہٹ دھرمی اور حق سے اعراض کی سیاہ پٹیاں نہیں بندھی ہیں۔ اور قہر الٰہی کے سبب اس کا دل سیاہ اور عقل سلب نہیں ہو گئی ہے۔ تو ایسے صدر جمال عبدالناصر کو مرزائی جماعت خلاف قانون قرار دینے اور

انکی جائداد ضبط کرنے کے عدیم المثال دینی کارنامہ پر تحسین و آفرین کہنا چاہیئے جس اہم اسلامی فریضہ کی ادائیگی کے سلسلہ میں دنیائے اسلام کے مرکز و محور سعودی عرب ہمیشہ سبقت لے جاتا رہا ہے۔ یکایک اس میں کیوں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اور ایک اہم اسلامی فریضہ کی بجا آوری کی سعادت ناٸر ایسے گنہگار مسلمان کو حاصل ہوئی!

مقام شکر ہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ مصر اور افغانستان کے علاوہ دیگر کئی اسلامی ملک ایسے ہیں جہاں کے باغیرت و حمیت مسلمان ارباب اقتدار نے اسلام کے بنیادی عقیدہ ختم نبوت کا تحفظ کرتے ہوئے حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اجراء نبوت و رسالت کا ناپاک دعویٰ کرنیوالی جماعت احمدیہ مرزائیہ، قادیانیہ کو برطانوی سامراج کی جاسوس ہونے کے جرم میں خلاف قانون قرار دے رکھا ہے اور یہ ملک ایسے ہیں جن میں نہ تو کوئی مرزائی تبلیغ کے بہانے جا سکتے ہیں اور نہ اپنے دفاتر قائم کر سکتے ہیں۔

یہاں پر اس بات کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا کہ مرزائی جماعت کو جب مصر میں خلاف قانون قرار دیا گیا۔ اور انکے دفاتر سربمہر کر دیئے گئے تو انہوں نے مصر سے نکل کر اسرائیل میں پناہ لی اور اب بھی اس جماعت کا اسرائیل میں باقاعدہ دفتر موجود ہے اور مرزائی مبلغ سامراجی جاسوس اور استعماری ایجنٹوں کی حیثیت سے اسلامیان عرب کے خلاف پراسرار سازشوں میں مصروف کار ہیں۔

ذاتی اور اجتماعی مفادات

دوسروں کی عیب جوئی اور ان پر جائز وناجائز تنقید بڑا آسان مشغلہ ہے ایسے ناقدین کی زبانیں کھل جائیں۔ تو وہ منزہ عن الخطا ذاتِ باری تعالیٰ کو بھی معاف نہیں کرتی ہیں لیکن جب کوئی ناقدین کی اپنی "ذات شریفہ" کے بارے میں ادنیٰ لب کشائی کرنا چاہے تو وہ آسمان سر پر اٹھاکر شور مچانے لگ جاتے ہیں۔ کہ ہمیں ناروا تنقید کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ وہ اپنی کوتاہیوں اور خطاؤں کو بھی تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ وہ اپنے آپ کو معصوم عن الخطا سمجھتے ہیں۔ نیز دوسروں کے عیب انکی کمزوریاں اور کوتاہیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اجاگر کرنے کو بہت بڑا کارنامہ قرار دیتے ہیں۔ کچھ اسی نوعیت کے پروپیگنڈے کی مہم متحدہ عرب جمہوریہ کے صدر جمال عبدالناصر کے خلاف چلائی جارہی ہے۔

یہ تسلیم کہ ناصر معصوم عن الخطا نہیں۔ اسے ایک گنہگار مسلمان سمجھ بیٹھئے۔ لیکن سیاسی اختلاف رائے کے باعث نہ صرف اسکی ذات بلکہ اس کا ساتھ دینے والے پورے ملک اور وہاں کی کروڑوں مسلم آبادی کو اسلام ہی کے دائرے سے خارج کرنے کا فتویٰ صادر کر دینا کہاں کا انصاف اور کہاں کی دانش مندی و معقولیت ہے؟

ناصر کے عقاید و نظریات کو توڑ موڑ کر پیش کرنے والوں اور انہیں اپنی حسب منشاء معانی و مطالب پہنانے والوں کو بھی صدر ناصر کی ذاتی خوبیوں اور اس کی اسلام دوستی کا اعتراف کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

ناصر ذاتی طور سے پابند صوم و صلوٰۃ اور اسلامی جذبات حمیت و غیرت کا مالک مسلمان ہے۔ وہ جمعہ عیدین کی نمازیں بڑے التزام کے ساتھ مسجدوں میں جا کر باجماعت ادا کرتے ہیں۔ وہ اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے علمبردار اور خواہاں ہیں۔ دینی اور مذہبی پہلو کے علاوہ ذاتی اعتبار سے بھی وہ ایک دیانت دار اور بے غرض قسم کا مسلمان ہے۔ انہوں نے برسر اقتدار آنے کے بعد دیگر ارباب اقتدار اور بادشاہوں کی طرح ملک کی دولت اور اس کے وسائل و ذرائع کو اپنے ذاتی تصرف میں نہیں لیا ہے۔ بلکہ ملکی دولت اس ملک کے عوام اور مملکت کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کئے ہیں صدر ناصر انقلاب سے پہلے جس معمولی مکان میں رہتے تھے۔ وہیں مقیم ہیں۔ وہ اگر ذاتی منفعت چاہتے تو شاہ فاروق کے قصر شاہی کو اپنی

عیش و عشرت کا گہوارہ بنا سکتے تھے۔ لیکن ان کے سخت مخالفوں کو بھی اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان کا دامن ذاتی جلب منفعت اور نفع اندوزی کی آلودگیوں سے پاک ہے۔ ناصر کے بچے اب بھی سائیکلوں پر سکول کو جاتے ہیں۔ میڈیکل کالج میں داخلے کے لئے مطلوبہ نمبروں سے صرف دو تین نمبروں کی کمی کے باعث انکی اپنی لڑکی داخلے سے محروم رہ گئی۔ لیکن ناصر نے اپنی بچی کا مستقبل سنوارنے کے بہانے مقررہ طریق کار میں کوئی ترمیم گوارہ نہ کی۔ آج۔ جب ہم عربوں کی شکست کے اسباب معلوم کرنے کے لئے انکی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ اور شکست کے محرکات سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیں صرف ناصر ہی نہیں بلکہ عالم عرب کے تمام حکمرانوں اور وہاں کے عوام کی عملی زندگیوں کو ضرور پیش نگاہ رکھنا چاہیئے۔ اور اس بات کا اچھی طرح موازنہ کرنا چاہیئے۔ کہ خداوند قدوس اور اس کے آخری پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں کیا حکم دیا ہے اور کیا ہم ان احکام کی خلاف ورزی تو نہیں کر رہے ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے۔

واعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل (آیت)

ترجمہ "اور دشمنوں کے مقابلے کے لئے قوت و طاقت کا جو بھی سامان حرب تیار کر سکتے ہو۔ بروئے کار لاؤ

اب دیکھنا یہ ہے کہ خداوند قدوس کے اس واضح فرمان کے مطابق مسلم قوموں اور اسلامی مملکتوں کے "دفاع و تحفظ" کے لئے جو معیار قائم کیا گیا ہے۔ ہم میں سے کس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی اس کے عین مطابق ہے ذاتی طور سے ہم موجودہ حالات میں "مختلف مسلمان حکمرانوں" کی عظیم غلطیوں اور انکی بڑی بڑی کوتاہیوں کی نشاندہی کو بھی خلاف مصلحت سمجھتے ہیں۔ اور یہ وقت انکی نجی زندگیوں سے "نقاب کشائی" کے لئے موزوں نہیں ہے۔ لیکن جب مغربی طاقتیں ایک منظم پروگرام کے تحت عربوں پر ظلم واستبداد اور ہلاکت وتباہی کی ایک قیامت برپا کرکے گمراہ کن پروپیگنڈہ کے ذریعہ یہ تاثر دینے کی کوشش کریں کہ دراصل امریکہ و برطانیہ یا اسرائیل کا کوئی قصور نہیں یہ سارا مصر کے جمال ناصر کا قصور ہے۔ چنانچہ کراچی کے ایک مقالہ نویس پیر علی محمد راشدی عرب و اسرائیل کے زیر عنوان تحریر فرماتے ہیں

> امریکہ و برطانیہ کے کہنے کے مطابق سچی بات تو یہ ہے کہ امریکہ یا برطانیہ والوں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ فی الحقیقت یہ سارا قصور مصری مفکروں کا تھا۔ جن میں اسرائیل کے مقابلہ کی قوت تو تھی نہیں۔ لیکن وہ خواہ مخواہ جلدبازی کرکے مقابلے پر اتر آئے اور اپنے کئے کا خمیازہ اٹھا کر بیٹھ گئے اور اب ہم پر یعنی امریکہ اور برطانیہ پر الزام دے کر اپنی سوجھ اور کردار کی غلطیوں اور روایتی کمزوریوں کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

(روزنامہ جنگ ۱۷ جون ۱۹۶۷ء)

مغربی حکومتوں اور اس کے ہمنواؤں کے غلط تاثرات دور کرتے ہوئے اسرائیل
سے مقابلے کی تیاریوں اور توازن قوت کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے ہوئے
دیانت داری کے ساتھ ہم یہ دیکھیں کہ مصری منکروں (جمال ناصر) کا اس
میں کتنا قصور ہے؟ اور انہوں نے واقعی اسرائیل کے مقابلہ کے لئے حسبِ فرمانِ
خداوندی "قوت و طاقت" کا سامان فراہم کیا یا نہیں۔ اور جو افراد یا جو ممالک
پروپیگنڈے کا گولہ بارود ناصر کے خلاف قائم کردہ محاذ پر صرف کر رہے
ہیں۔ اس معیار پر وہ خود کس قدر پورے اترتے ہیں؟

صدر ناصر — مصر کے بادشاہ یا بلا شرکت غیرے وارث نہیں ہیں
وہ مصری عوام کے منتخب شدہ صدر ہیں اور عوام کے منتخب نمائندوں
کے ذریعہ پورے ملک کے سامنے جواب دہ ہیں۔ وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں
ملک اور عوام ہی کے لئے ہے۔ اسکی پوری زندگی سامراجی قوتوں کی گہری
سازشوں (جس کے ذریعہ خطہ عرب کے ٹکڑے کر کے چھوٹی چھوٹی ریاستیں
بنا کر عربوں کی اجتماعیت مفلوج کر دی گئی ہے) اور اسرائیلی جارحیت کے
دفاع و انسداد کے لئے وقف ہے۔ لیکن دوسری جانب بعض ملک ایسے بھی ہیں
جن میں ملوکیت اور بادشاہت کا نظام رائج ہے اور وہاں کے سربراہانِ
مملکت ایسے ہیں جو ملک کے تمام ذرائع آمدنی پر بلا شرکت غیرے قابض ہیں،
اور بے اندازہ ملکی دولت صرف انکے ذاتی عیش عشرت اور سامان تعیش پر
صرف ہو رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تیل و پٹرول اور سونے وغیرہ معدنیات سے عرب ملکوں

کو خوب مالا مال کیا ہے۔ اور یہی ایک دولت ایسی ہے جس سے اہل اسلام اپنی تعمیر وترقی اور ملکی دفاع واستحکام کے لئے عصر حاضر کا جدید ترین سامان ضرب وحرب مہیا کر سکتے ہیں۔ اور اس بے پناہ دولت سے جدید ترین اسلحہ سازی کے کارخانے اور ایسی فیکٹریاں قائم کی جاسکتی ہیں جو مسلمانوں کی دفاعی وجنگی ضروریات فراہم کرکے دنیائے اسلام کو غیروں کی احتیاج سے بالکل بے نیاز کر دیں۔ اور یہی طریق کار ایسا ہے جس کے ذریعے امریکہ برطانیہ اور روس وغیرہ مغربی طاقتوں کی بالادستی سے چھٹکارا پایا جاسکتا ہے۔ لیکن — اگر محولہ بالا فرمان خداوندی پر عمل کرنے کی بجائے اپنا قیمتی سرمایہ اور ملک کے تمام وسائل وذرائع اپنے عیش وتنعم، اور ذاتی آسودگیوں پر لگائیے جائیں۔ یا غیر ملکیوں کے بنکوں میں دولت جمع کرکے اس سے غیروں کو استفادہ کا پورا موقع فراہم کیا جائے تو اپنے آپ پر اور ملت اسلامیہ پر اس سے بڑی تعدی وزیادتی اور کیا ہوسکتی ہے؟

آج یہ حقائق بیان کرتے ہوئے ہمیں سخت کوفت محسوس ہو رہی ہے کہ گذشتہ چند برسوں میں جب کہ اسرائیل عربوں کے مقابلہ کے لئے وسیع پیمانہ پر جنگی سامان تیار کر رہا تھا تو دنیائے اسلام کے مرکز وحور سعودی [illegible] دو بھائیوں کے درمیان اقتدار کی رسہ کشی جاری تھی۔ حالات وواقعات نے آخرکار ایک بھائی کو تخت اقتدار سے محروم کرنے پر مجبور کر دیا اور اس نے اپنے ملک میں رہنے کی بجائے جلاوطنی کو ترجیح دی۔

بادشاہوں کی غریب الوطنی بھی شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ سے ہوا کرتی ہے چنانچہ

انہوں نے زادِ راہ کے طور پر صرف ساٹھ ٹرکوں پر سامان لاد کر اپنے ملک کو خیرباد کہہ دیا۔

مسافرت کے عالم میں ان ساٹھ ٹرکوں پر کیا رکھا گیا تھا۔ اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب شاہ سعود مختلف ممالک میں "غربت و مسافرت" کی زندگی گذارنے اور باہمی اختلافات کے مطلع سے تاریک بادل چھٹنے کے بعد متحدہ عرب جمہوریہ کے صدر جمال عبدالناصر کے پاس آگئے۔ شاہ نے صدر کی درخواست پر اسرائیلی جارحیت اور سامراجیوں کے خطرناک عزائم کا شدید احساس کرتے ہوئے اپنے "بے انداز زادِ سفر" میں سے مصر کو ایک سو ملین ڈالر (قریباً پچاس کروڑ روپے) بطور قرض دیئے۔

نازک وقت میں یہ امداد واقعی لائقِ تحسین اور قابلِ ستائش ہے اور اس مستحسن جذبے کی قدرافزائی ضروری ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان لوگوں کو خدا تعالیٰ نے تیل اور سونے کے ذخائر کی شکل میں بے انداز نعمتوں پر اس لئے قبضہ و تصرف بخشا ہے کہ اس میں ملک اور ملت کی فلاح بہبود اور ان کے اپنے تحفظ و بقا کا کوئی حصہ نہ ہو! ذرا تصور تو فرمایئے کہ جو شخص غریب الوطنی اور مسافرت میں قریباً پچاس کروڑ روپے کو قرض دے سکتا ہے۔ اس کے پاس ذاتی اخراجات کے لئے اور کیا کچھ کیا ہوگا۔؟ اور پھر جس مملکت سے وہ جلا وطن ہو کر آیا ہے۔ اس کی بے انداز دولت کا بھی خیال فرمایئے!

اس دولت سے سعودی عرب کے عوام کے لئے نہ تو کوئی کارخانہ ہے۔ نہ اسلحہ ساز فیکٹری نہ ہی ضرورت کے مطابق جنگی ساز و سامان کی فراوانی۔ نہ

عوامی فلاح وبہبود کے ادارے ۔حتیٰ کہ یہ معلومات آپ کے لئے یقیناً حیران کن ہوں گی کہ وہاں جامعہ ازہر کے مقابلہ کے لئے مکہ میں یونیورسٹی تو قائم کر دی گئی ہے لیکن عام مسلمانوں کی تعلیم قرآن کیلئے شاہ سعود کے بعد پاکستان ہی کے ایک مخیر تاجر حاجی محمد یوسف سیٹھی مالک سٹرا ملز دا ہوالی کو وہاں قرآنی ادارے قائم کرنے کی سعادت نصیب ہوئی اور ہمیں اس بات کا اظہار میں سخت ندامت محسوس ہو رہی ہے کہ صرف قرآن حفظ کرنے کے لئے سعودی عرب کے بہت سے بچے پاکستان کا سفر اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ پاکستان کی مختلف درسگاہوں میں بھی چند بچے قرآن حفظ کر رہے ہیں۔

سعودی حکمران شاہ فیصل نے پاک، بھارت جنگ کے موقع پر تعاون واشتراک کی جو لازوال مثال قائم کی تھی۔ پاکستانی عوام اور حکومت انکے بے حد مداح اور شکر گذار ہیں۔ لیکن سوال اسرائیلی یہودیوں اور سامراجیوں کے مقابلہ میں تیاری اور ذاتی دلچسپی کا ہے۔ عربوں کی شکست کے اسباب بیان کرتے ہوئے جہاں صدر ناصر کی ذات، ان کے نظریۂ عرب قومیت اور جدید ترین اسلحہ سے عربوں کی تہی دامنی کو بنیاد قرار دیا جاتا ہے۔ وہاں انہیں عرب حکمرانوں کی ذاتی دلچسپیوں، ان کے عمل و کردار، اور ملک وملت کی تعمیر و ترقی اور دفاع و استحکام کے سلسلہ میں انکی تیاریوں اور منصوبہ بندیوں کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینا چاہیئے۔ اور کسی تعصب اور جانبداری کے بغیر ٹھنڈے دل ودماغ کے ساتھ مسئلہ کے اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ ذاتی اور اجتماعی مفادات کے لئے عرب حکمرانوں کا انداز عمل کیا ہے۔ اور کیا اسرائیل اور

سامراجیوں کی جارحیت کا ہدف مصر اور شام، الجزائر اور سوڈان ہی ہیں جو ملوکیت اور شاہانہ نظام حکمرانی سے آزاد ہو کر یہود و نصاریٰ سے پوری جوانمردی کے ساتھ برسر پیکار اور نبرد آزما ہیں۔ پاکستان، لیبیا، سعودی عرب اور اردن کے علاوہ پوری دنیائے اسلام انکی جارحیت اور ان کے ظلم و استبداد کا براہ راست نشانہ ہیں۔ اور انکی روز افزوں جارحیت سے بچنے کے لئے اسلام اور اہل اسلام کی عزت و عظمت اور اس کے تحفظ کے لئے ان عرب حکمرانوں نے فرمان خداوندی کے مطابق کیا دفاعی تیاریاں کی ہیں؟

اس ذاتی تقابل اور موازنہ سے اس بات کا اندازہ لگاتے ہیں ہمیں خوب روشنی ملتی ہے کہ جب تک مسلمان اپنی تمام تر صلاحیتوں اور اپنے تمام تر وسائل و ذرائع کو اسلام ہی کے لئے وقف نہیں کریں گے۔ اصلاح پذیر انقلاب کی توقع رکھنا عبث ہے۔

یہودی سازش
کتاب کی اشاعت کا پس منظر

سامراجیوں کا اندازِ کار یہ ہے کہ جہاں کسی خاص مقصد کے حصول میں قوت و طاقت کا بھرپور استعمال ناکافی محسوس ہوتا ہو تو اپنی مہم کو کامیاب اور جدوجہد کو کارگر بنانے کے لئے پروپیگنڈے کا ایک منظم اور بھرپور نظام تیار کرتے ہیں۔ پھر اپنے پروپیگنڈے کے ہدف (TARGET) کے خلاف نفرت انگیز اور حقارت آمیز مہم چلائی جاتی ہے تاکہ اس کے متعلق لوگوں کا تمام تر حسنِ ظن نفرت میں تبدیل ہو جائے اور اس کے ساتھ ہمدردی اور غمخواری کا ادنیٰ سا جذبہ بھی باقی نہ رہے۔

مغربی پروپیگنڈا بازوں کی اس نئی تکنیک کے متعلق معلومات فراہم کرتے ہوئے ماہنامہ اردو ڈائجسٹ لاہور میں ظفر اسعد انصاری نے اپنے انٹرویو میں لکھا ہے۔

"یہودیوں اور عیسائیوں کا دنیا کے بڑے بڑے اخبارات اور خبر رساں

ایجنسیوں پر قبضہ ہے وہ ان کے ذریعے خبروں کو ایک الیارنگ دیتے ہیں
جس سے اسلامی ملکوں نئے نئے فتنے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں پہلے کسی مسلمان
ملک کے بارے میں ایک فیصلہ کرتے ہیں اور پھر اس فیصلے کے لئے خبر رساں
ایجنسیوں کے ذریعہ راستہ ہموار کرتے ہیں اور بالآخر وہ فیصلہ نافذ کر دیا جاتا ہے
وہ مختلف ملکوں میں مختلف تحریکیں اور نعرے چھوڑ دیتے ہیں، پھر خبریں مسلسل
اس انداز کی دی جاتی ہیں جن سے ان نعروں کو تقویت ملتی ہے یہ سارا کام
اتنی ہوشیاری سے ہوتا ہے۔ کہ اکثر سادہ لوح پڑھے لکھے مسلمان ان نعروں
کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جب تک صورت حال یہی رہتی ہے اسلامی اتحاد کی آرزو
پوری نہیں ہو سکتی۔"

("ماہنامہ اردو ڈائجسٹ ماہ نومبر ۱۹۶۶ء)

مندرجہ بالا خط کشیدہ تحریر ایک بار پھر پڑھ لیجئے اور انصاف سے کام
لے کر ایک مسلمان ملک اور اس کے سربراہ کو پیش نگاہ رکھ کر خود ہی فرمایئے
کیا یہودی خبر رساں ایجنسیوں نے صدر ناصر کی مخالفت میں یہی گھناؤنا کردار
ادا نہیں کیا ہے ؟

اور پر لطف بات یہ ہے کہ پروپیگنڈا ہم کا بیان کردہ سازشی ہوائی
انٹرویو میں داخل کیا گیا جو انصاری صاحب نے "صدر ناصر کو یہودیوں
کا ایجنٹ ثابت کرنے کے لئے اردو ڈائجسٹ کے ایڈیٹر کو دیا تھا ۔؟
اور عرب و اسرائیل جنگ کے بعد کے حالات و واقعات نے یہ ثابت کر دیا ہے
کہ یہ انٹرویو اور اس کے مندرجات بھی اسی گھناؤنی سازش کے ناپاک سلسلہ

کی مختلف کڑیاں ہیں اور صدر ناصر کے خلاف گمراہ کن پروپیگنڈے کا ناٹک اس لئے رچایا گیا تھا تاکہ اس سے ۱۹۵۶ء کی شاندار فتح کا بدلا لیا جاسکے۔

الغرض ——— مختلف ملکوں میں پراسرار خدمات انجام دینے والی سی آئی اے کے ایجنٹوں اور امریکی ڈپلومیسی کے پروپیگنڈا باز افراد اور جماعتوں نے اسی منصوبہ کے تحت عربوں کے مفادات اور صدر ناصر کے خلاف پروپیگنڈا کرنے اور ان پر طرح طرح کے الزامات عائد کرنے کی جس مہم کا آغاز کیا تھا پاکستان میں اس کا جھنڈا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی زیر قیادت جماعت اسلامی نے اٹھا رکھا ہے انہوں نے یہودی خبر رساں ایجنسیوں کی فراہم کردہ معلومات کو نہایت ڈرامائی انداز میں پیش کرنے کے لئے وہی ٹیکنیک اختیار کی ہے جس کی انہیں تربیت دی گئی ہے۔

جماعت اسلامی کے زیر اہتمام شائع ہونے والے اخبارات و رسائل (خصوصاً عرب اسرائیل جنگ سے چند ماہ قبل سے لیکر آج تک) کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام کا مقدس نام لیکر صدر ناصر اور اس کے ہمنوا مسلمان حکمرانوں کے خلاف مسلسل پروپیگنڈے کی مہم کیوں چلائی گئی ہے اور یہ کھیل کس کے اشارۂ ابرو پر کھیلا جارہا ہے۔

جہاں تک مسٹر ظفر احمد انصاری کی ذات کا سوال ہے وہ کراچی میں جماعت اسلامی کی دستوری مہم کے کرتا دھرتا رہے ہیں۔ اور ان دنوں امریکی آڑھت کی دکان اسلامک سنٹر جنیوا (سوئٹزرلینڈ) کے رکن کی حیثیت سے پراسرار خدمات انجام دینے پر مامور دکھائی دیتے ہیں۔

مسٹر انصاری نے صدر ناصر کو یہودیوں کا ایجنٹ ثابت کرنے کی مذموم سعی کرتے ہوئے اپنے انٹرویو میں یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ۔

" انگریزوں نے شاہ فاروق کو رام کرنے اور ڈرانے دھمکانے کے تمام حربے استعمال کئے ۔ لیکن شاہ فاروق نے اپنی رائے تبدیل نہ کی اور دراصل اس مسئلے پر انگریزوں اور شاہ فاروق کے درمیان گفتگو منقطع ہوگئی یہ ۱۹۵۱ء کا وسط تھا ۔ اسلام دشمن طاقتوں نے اسی وقت شاہ کو ہٹانے کا فیصلہ کر لیا ۔ چنانچہ موزوں آدمی کی تلاش شروع ہوگئی ۔ اب وہ چاہتے تھے کہ ایک تیر سے دو شکار کئے جائیں ۔ یعنی مصر میں کوئی ایسا شخص برسراقتدار لایا جائے جو ایک طرف مصر اور سوڈان کو متحد نہ ہونے دے اور دوسری طرف اخوان کی تحریک کو کچل کر رکھ دے ۔ انکی نظر انتخاب جمال ناصر پر پڑی ۔ اس کے لئے راستہ تیار کیا گیا اور بالآخر ۱۹۵۲ء میں فاروق کو تخت و تاج سے محروم کر دیا گیا ۔

جمال ناصر نے برسراقتدار آنے کے بعد ان مقاصد کی تکمیل کے لئے کام کرنا شروع کر دیا گیا جو اسے پہلے بتا دیئے گئے تھے ۔ اس نے سوڈان کو مصر سے متحد نہیں ہونے دیا ۔ اخوان کے پچاس ہزار افراد شہید کئے اور عرب ممالک کی پیٹھ میں ایک ایسا زہر آلود خنجر گھونپ دیا جس کا زخم سُندا جانے

منزل ہوگا بھی یا نہیں۔ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ ناصر یہودیوں کا آلۂ کار ہے
(اُردو ڈائجسٹ لاہور ماہ نومبر ۱۹۶۶ء ص ۳۹)

یوں تو انصاری صاحب کا یہ فراہم کردہ سارا مواد ہی "یہودی سازش" کا زندۂ جاوید ثبوت ہے ورنہ وہ حقائق و واقعات کے سراسر خلاف کہتے ہوئے ضرور کچھ شرم و ندامت محسوس کرتے۔

اور یہ تو کسی فاتر العقل شخص کے ذہن میں بھی اتنی معلومات کا دھندلا سا خاکہ ضرور موجود ہوگا۔ کہ شاہ فاروق انگریزوں کے زبردست حامی تھے اور انگریز شاہِ مصر کے پشت پناہ اور مددگار تھے! شاہ فاروق کی عیش پسندی اس کا استبداد۔ اور ملکی معاملات سے اس کی بے توجہی و بے رغبتی ہی نے مصری عوام کو مجبور کر دیا تھا کہ شاہ سے تختِ اقتدار چھین کر ملک کا نظام کار ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں دیدیں۔ جو فی الحقیقت ملک و ملت کی تعمیر و ترقی میں خوب دلچسپی رکھتے ہوں اور خدمت قوم کے حقیقی جذبہ سے سرشار ہوں

اس مقدس مہم میں وہاں کی دینی و سیاسی تنظیم اخوان المسلمین نے بڑا اہم رول ادا کیا تھا۔ اور اس کے تعاون و اشتراک سے بالآخر جنرل نجیب کی زیرِ قیادت یہ مہم کامیابی سے ہمکنار ہوئی تھی۔ اور شاہ فاروق محروم اقتدار ہو کر جلا وطن ہو گیا تھا۔

ہاں عبدالناصر تو انقلابی کونسل کے ایک رکن کی حیثیت رکھتے تھے اخوانیوں کی نگاہِ انتخاب اگر پڑ سکتی تھی تو جماعتی حیثیت سے اخوان المسلمین پر اور انفرادی اعتبار سے جنرل نجیب پر! لیکن یہ عجیب طرفہ ہے کہ مغربی

پروپیگنڈا بازوں کے یہ ایجنٹ اُلٹی منطق سے کام لینے کی مذموم کوشش کر رہے ہیں۔ اگر جمال عبدالناصر نے بقول ظفر احمد انصاری ان مقاصد کی تکمیل کے لئے کام شروع کر دیا تھا جو اس سے پہلے سے تیار کئے گئے تھے تو ۱۹۵۶ء میں نہر سویز پر قبضہ کرنے کی ہدایت بھی برطانیہ کے ان انگریز ناظروں نے جاری فرمائی تھی اور سرزمین مصر سے تمام انگریزوں اور ان کے ایجنٹوں کو نکال باہر کرنے کا کام بھی انگریزوں ہی کے بتلائے ہوئے طریق کار کے مطابق تھا۔ ع لعنۃ اللہ علی الکٰذبین۔

اور انصاری صاحب کی یہ معلومات، کس قدر مضحکہ خیز ہیں کہ ۱۹۵۱ء کے وسط میں اسلام دشمن طاقتوں نے، شاہ فاروق کو ہٹانے کا تہیہ کر لیا۔ ان طاقتوں میں کیا اخوان المسلمین بھی شریک تھی یا نہیں۔؟

کیا اخوان المسلمین فی الواقع اسلام دشمن عناصر کا مجموعہ تھی؟ (جیسا کہ ہر اچھی جماعت میں ایسے لوگ سازش کے طور داخل ہو جایا کرتے ہیں) تو ایسے عناصر کی سرکوبی میں ناصر کو مطعون کیوں ٹھہرایا جا رہا ہے؟

لمحہ بھر کے لئے آپ تسلیم کر لیجئے کہ ناصر بہت بڑا مجرم ہے اور اس نے شاہ فاروق ایسے "خلیفہ راشد" اور حکم عادل کو انگریزوں کے ساتھ ساز باز کر کے تخت اقتدار سے خواہ مخواہ محروم کر کے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا ہے۔۔۔ لیکن مودودی صاحب اور ان کے ہمنوا کیا یہ معلومات فراہم کر سکیں گے۔ کہ دس پندرہ افراد کی بجائے اخوان المسلمین کے "پچاس ہزار" افراد کو شہید کرنے کی تعداد انہیں کہاں سے دستیاب ہوئی؟

اور اگر بقول ظفر احمد انصاری کہ تعداد غلط شائع ہو گئی ہے اور اردو ڈائجسٹ والوں نے ان کا تردیدی خط شائع نہیں کیا۔ تو ملک کے دیگر اخبارات میں انکی تردید سے پہلو تہی اختیار کرنے میں ان کی کیا مصلحت تھی۔ کیا ناصر سوڈان و مصر کے اتحاد کا حامی تھا یا مخالف ---؟ اور ان ممالک کا جو اتحاد قائم ہے وہ انگریزوں کا مرہون منت ہے یا جمال عبدالناصر کا ---؟

کذب و افتراء کے پہاڑ توڑنے اور جھوٹ کے طوفان ابھارنے میں واقعی ان بزرگوں نے ریکارڈ توڑ ڈالے ہیں اور اپنے سامراجی آقاؤں کا حق نمک ادا کر دیا ہے۔

ان مغربی پروپیگنڈا بازوں نے اسرائیل سے حملہ کرانے سے پہلے اپنے سازشی منصوبہ کے تحت پہلے تو مسٹر انصاری کی وساطت سے صدر ناصر کو یہودیوں کا آلۂ کار ثابت کرنے کی ناپاک مہم چلائی پھر جماعت اسلامی کے ایک رکن اور سابق ناظم اعلیٰ نشر و اشاعت جماعت اسلامی پاکستان مسٹر مصباح الاسلام فاروقی سے انگریزی زبان میں ایک کتاب لکھوائی جسے "یہودی سازش اور عالم اسلام" کے نام سے شائع کرکے پاکستان اور دیگر ممالک میں وسیع پیمانہ پر تقسیم کیا گیا اور سامراجیوں کے اہم مقاصد کی تکمیل کے لئے عرب اسرائیل جنگ کے دوران پھر اسے مارکیٹ میں پیش کیا گیا تاکہ میدان جنگ میں جدید ترین اسلحہ کے ساتھ مصر کو شکست دینے کے ساتھ ساتھ زہریلا پروپیگنڈا کرکے رائے عامہ کو صدر ناصر اور مصری عوام سے اس قدر متنفر کر دیا جائے کہ ان سے معاونت اور ہمدردی کا ادنیٰ جذبہ بھی باقی نہ رہے!

سامراجیوں کی ہدایت پر جماعت اسلامی کی طرف سے شائع کردہ "یہودی سازش" نامی کتاب کے مندرجات کیا ہیں اس کی صحیح معلومات تو مطالعہ ہی سے فراہم ہو سکتی ہیں لیکن یہاں پر اس بات کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ مسٹر ظفر احمد انصاری کا وہ نام نہاد انٹرویو بھی ——— تمام و کمال اسمیں درج ہے اور بلا خوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مندرجہ بالا انٹرویو کی اشاعت بھی "یہودی سازش" ہی کا ایک حصہ ہے جسے سامراجیوں کی خوشنودی حاصل کرنے اور ایک مسلمان سربراہ مملکت کو ذلیل و رسوا کرنے کی ناپاک سعی کے طور پر شائع کیا گیا ہے جبکہ حالات و واقعات عینی شاہد کی حیثیت سے سامنے موجود ہیں ــ صدر ناصر کی ذات مغربی سامراجیوں کی نگاہ میں ایک خار بن کر کھٹک رہی ہے۔

خدا بھلا کرے پاکستان کے ارباب اقتدار کا کہ انہوں نے "یہودی سازش" نامی کتاب میں عربوں، ترکوں اور صدر ناصر کے خلاف دیئے گئے زہر آلود اور گمراہ کن مواد کا نوٹس لے کر اسے ضبط کر لیا۔ لیکن جماعت اسلامی کے امیر مودودی صاحب حقائق سے تغافل برتتے ہوئے پاکستان کے ارباب اقتدار کو مورد الزام ٹھہرایا اور اپنے ایک اخباری بیان میں کہا کہ یہودی سازش نامی کتاب کی ضبطی سے عربوں میں یہ غلط تاثر قائم ہوگا۔ کہ پاکستان میں یہودیوں کے خلاف کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔

مودودی صاحب کو عربوں کے تاثرات کا اگر اتنا ہی احساس ہے تو خود جماعت اسلامی نے اپنے اخبارات و رسائل کے ذریعے عربوں اور

صدر ناصر کے خلاف جو مہم شروع کر رکھی ہے کیا عرب اس سے خوش ہیں اور کیا ان سے اظہار ہمدردی و غمخواری کا یہی طریق کار ہے جو انہوں نے اختیار کر رکھا ہے؟

"یہودی سازش" کی ضبطی پر پاکستان کے مؤقر روزنامہ "جنگ" کراچی نے اپنے معرکہ آراء اداریتی نوٹ میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ یقیناً اس لائق ہیں کہ امر حق معلوم کرنے اور اہل اسلام کے بارے اپنے صحیح جذبات ہمدردی اور اخوت کی فضا پیدا کرنے کے لئے انہیں بار بار پڑھا جائے۔ معاصر جنگ کے مدیر نے یہودی سازش کی ضبطی پر اپنے جچے تلے انداز میں لکھا ہے:۔

جماعت اسلامی کے امیر نے ایک بیان میں "یہودی سازش" نامی ایک کتاب کی ضبطی پر احتجاج کیا ہے اور کہا ہے کہ مذکورہ کتاب صرف اس لئے ضبط کی گئی ہے کہ اس کے مصنف جماعت اسلامی کے کارکن ہیں۔ امیر جماعت اسلامی نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کتاب کی ضبطی سے دنیا میں یہی تاثر پیدا ہوگا کہ پاکستان میں یہودی اثرات اس قدر غالب ہیں کہ یہاں یہودی سازش کو بے نقاب کرنے کی جرأت نہیں کی جا سکتی۔ پاکستان کی ایک ذمہ دار سیاسی جماعت کے ذمہ دار امیر کے قلم سے اس قسم کے خیالات پڑھ کر ہمیں بڑا تعجب ہوا۔ اس لئے کہ امیر جماعت اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ کتاب صرف عربوں کے کاز سے پاکستان کی

ہگری ہمدردی اور دلچسپی کے نتیجے میں کی گئی ہے۔ ویسے ہم اصولاً کتابوں
کی ضبطی کے اصول ہی کو قابل اعتراض سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کتاب
کی ضبطی جس بناپر کی گئی ہے۔ اسے غلط انداز میں پیش کرنا ایک ذمہ دار
عالم کیلئے نہایت قابل اعتراض بات ہے۔ امیر جماعت نے کہاہے کہ اس
کارروائی کے لئے غالباً یہ بہانہ بنایا گیا کہ اس میں صدر ناصر پر تنقید کی گئی ہے
حیرت ہے ایسے بہانہ کیوں کہا گیا جب کہ واقعہ یہ ہے کہ ضبطی کا اصل سبب
ہی صرف یہ ہے۔ چنانچہ گذشتہ دنوں مغربی پاکستان اسمبلی میں بھی اس
بنیاد پر مذکورہ کتاب کی ضبطی کا مطالبہ کیا جا چکا ہے۔ پھر کتاب میں صرف
صدر ناصر پر تنقید ہی نہیں کی گئی۔ کھل کر انہیں سیاسی گالیاں دی گئی ہیں
صدر ناصر پر تنقید کو اس وقت عالم اسلام میں کوئی برداشت نہیں کر سکتا
خاص طور پر عرب دنیا کسی قیمت پر صدر ناصر کی نکتہ چینی انگیز نہیں کریگی
عربوں کے اپنی احساسات کے احترام میں حکومت پاکستان نے یہ قدم اٹھایا
ہے۔ اس طرح اس اقدام سے عربوں میں پاکستان کی عزت بڑھے گی اور
دنیائے عرب یہ محسوس کریگی کہ حکومت پاکستان عربوں کے محترم قائد پر
کسی تنقید کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اب اس سے پاکستان
کا وقار بڑھے گا کم ہونے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ صدر ایوب کی قیادت
میں پاکستان نے عربوں کے لئے جو کچھ کیا ہے۔ اسے ساری دنیا جانتی ہے۔ اور
تمام عالم اسلام اس پر مدح و ثناء کر رہا ہے۔ اب اس اقدام پر عرب دنیا
میں تعریف کی جائے گی کہ صدر ایوب عربوں کے احساسات کا کس قدر

احترام مدنظر رکھتے ہیں کہ انہوں نے صدر ناصر پر تنقید کو برداشت نہ کیا اور اس کتاب کو ضبط کر لیا جس سے اسلامی دنیا کے احساسات مجروح ہونے کا امکان تھا۔ اس اقدام کو اس روشنی میں دیکھنے کی بجائے الٹا یہ الزام عائد کرنا کہ مذکورہ کتاب کی ضبطی پاکستان میں یہودیوں کے اثرات غالب ہونیکا شبہ پیدا کریگی۔ انتہائی افسوسناک انداز نظر ہے۔ جو کم سے کم امیر جماعت اسلامی جیسے شخص کو زیب نہیں دیتا۔ اس مرحلہ پر صدر ناصر پر تنقید یہودیوں کی حمایت اور عربوں کے دشمنوں کی تائید ہے۔ اس لئے اس نوع کی سنگین غلطی کا کبھی کو ارتکاب نہ کرنا چاہیئے۔ اور عربوں کے محترم قائد صدر ناصر پر زبان طعن دراز کر کے تل ابیب کے ہاتھوں میں ہرگز نہ کھیلنا چاہیئے۔

(روزنامہ جنگ کراچی ۱۹ر جولائی ۱۹۶۷)

یہودی نژاد لڑکی —— مریم جمیلہ

جماعت اسلامی کے حلقہ میں ایک سکینڈل

کتاب یہودی سازش کی اشاعت کے بعد جماعت اسلامی کے سرکاری ترجمان ہفت روزہ "ایشیا" لاہور نے "یہودیت بنام صیہونیت" کے زیر عنوان "مریم جمیلہ" کے نام سے کئی قسطوں میں ایک مضمون شائع کیا ہے۔

"مریم جمیلہ" جس کا پہلا نام مارگریٹ مارکوئس تھا ایک یہودی نژاد لڑکی ہے جو مبینہ طور پر مودودی صاحب کے لٹریچر سے متاثر ہو کر امریکہ سے پاکستان آگئی اور یہاں آ کر پہلے کئی ماہ تک مودودی صاحب کے ہاں اچھرہ میں قیام پذیر رہی۔ اس اثناء میں جماعت اسلامی کے حلقے میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں کہ مودودی صاحب اس لڑکی کی شادی اپنے لڑکے عمر فاروق کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں اور بعض نے خود مودودی صاحب ہی کا نام لینا شروع کر دیا۔ اس طرح کی افواہوں اور سرگوشیوں سے جماعت اسلامی کے حلقوں میں خوب گہما گہمی پیدا

ہوگئی۔ لاہور کے علمی و ادبی اور سیاسی حلقوں میں اس کا خوب چرچا ہونے لگا اور خود مودودی صاحب کے اپنے گھر میں بھی بدگمانیوں کی ایک عجیب فضا پیدا ہوگئی اور جب اسلامی تعلیمات کے خلاف طرز عمل اختیار کیا جائے گا تو ایسی فضا کا پیدا ہو جانا کوئی بعید از قیاس بات نہیں ہوتی. کیونکہ محسن کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان تو یہ ہے کہ "تہمت اور بدگمانی کی جگہوں سے بھی اپنے آپکو بچائے رکھو!

اس لڑکی کو اپنے گھر میں رکھ کر جب تہمت کے مواقع خود مہیا کئے گئے تو بدگمانیوں نے بھی جنم لے لیا۔

ایسی متضاد اور معنی خیز خبروں کی صداقت اور حقیقت حال معلوم کرنے کے لئے لاہور کے ایک اخبار نویس نے جماعت اسلامی کے مرکزی دفتر میں مودودی صاحب سے ملاقات کا پروگرام طے کیا۔

مودودی صاحب سے ملاقات کے دوران جب مریم جمیلہ سے شادی کا ذکر آیا تو انہوں نے جواب دیا کہ شریعت اسلامیہ کی رو سے یہ کوئی معیوب بات تو ہے نہیں کہ ایک نومسلم لڑکی سے نکاح کر لیا جائے اور اگر اس لڑکی کے تحفظ کے لئے ایسا ہی کرنا پڑے تو اس میں حرج کی کونسی بات ہے؟ ویسے ان خبروں میں کوئی صداقت نہیں ہے۔"

مودودی صاحب کی وضاحت پر اس اخبار نویس نے خبر کا مناسب پہلو اپنے اخبار میں شائع کر دیا۔ اس کے چند روز بعد جماعت اسلامی کے جرائد و رسائل میں یکایک خبر شائع ہوئی کہ مریم جمیلہ کی صحت خراب ہوگئی ہے اور اس کا دماغی توازن قائم نہیں رہا ہے۔ اس کے لئے دعائے صحت کی جائے۔

پھر معلوم ہوا کہ اس لڑکی کو بغرض علاج تتو کی (ضلع لاہور) میں جماعت اسلامی

کے سرگرم رہنما جناب حکیم نعمت علی صاحب کے ہاں بھیجدیا گیا ہے۔
حکیم صاحب نے مریم جمیلہ کو بنا کر اپنے گھر میں رکھ لیا۔
پتوکی بھیجتے وقت حکیم نعمت علی صاحب کو مودودی صاحب نے یہ تاکید کی تھی کہ اس لڑکی کی شادی کا پروگرام طے کرتے وقت مجھ سے مشورہ ضرور کر لیا جائے۔ اور جب اس کے رشتے کے لئے موزوں افراد مل جائیں تو انہیں ملاقات کے لئے میرے پاس بھیجا جائے تاکہ مجھے بھی تسلی اور پورا اطمینان ہو جائے۔

لاہور سے جا کر پتوکی ایسے پسماندہ قصبہ ناموزوں ماحول اور علاج معالجہ کے جدید ترین وسائل کے فقدان کے باعث مریم جمیلہ کی صحت مزید خراب ہو گئی حکیم صاحب کی رائے تھی کہ اسے دماغی عارضہ نہیں بلکہ ہسٹیریا کے دورے پڑ رہے ہیں اور اسے اگر دماغی عوارض کے ہسپتال میں داخل کرا دیا جائے تو ممکن ہے وہاں کے سائنٹیفک طریق علاج سے اس کی صحت بحال ہو جائے چنانچہ مریم جمیلہ کو پتوکی سے لاکر لاہور کے پاگل خانہ میں داخل کرا دیا گیا

اس اثناء میں جماعت اسلامی کا ایک نوجوان کارکن محمد یوسف خاں (جو مرکزی دفتر میں جماعت اسلامی کی مطبوعات کی کتابت وغیرہ کرانے کی معمولی خدمت پر مامور تھا۔) مریم جمیلہ کو دماغی عوارض کے ہسپتال میں اشیاء خورد و نوش اور دیگر ضروریات زندگی مہیا کرتا رہا۔ چند روز بعد جب اس کی صحت قدرے بحال ہو گئی تو اسی خدمت گزار کارکن محمد یوسف خاں کے ساتھ اس لڑکی کا پراسرار طریق سے نکاح کر دیا گیا۔ حالانکہ خان صاحب کے گھر میں

پہلے بھی ایک بیوی بقید حیات ہے اور وہ صاحب اولاد ہے۔!
سچ ہے۔ ؎ ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد

محمد یوسف خاں کے ساتھ مریم جمیلہ کے نکاح کے بعد جماعت اسلامی کے نوجوان گروپ میں رقابت اور مسابقت کا سماں بندھ گیا۔ جس پر قابو پانے کے لئے مودودی صاحب نے انضباطی کاروائیوں کا سہارا لیا۔ لیکن یہ اقدام کارگر ثابت نہ ہوا۔ اور بالآخر صالحین کے اس طائفہ کے بارے میں ایسی ایسی باتوں کا انکشاف ہوا کہ

کسی بت کدے میں بیاں کروں
تو کہے صنم بھی ہری ہری

سوال پیدا ہوتا ہے کیا مریم جمیلہ کو پاکستان میں آنے سے پہلے بھی دماغی عارضہ لاحق تھا اگر نہیں تو اسے کس ذہنی کوفت میں مبتلا رکھا گیا کہ اس کا دماغی توازن بگڑ گیا اور پھر ایک ایسے نوجوان کے پلے کیوں باندھ دیا گیا۔ جو پہلے ہی سے شادی شدہ ہے اور صاحب اولاد بھی ہے۔ اور جو اپنی امریکی بیوی کی زبان سے بھی کماحقہ واقف نہیں ہے۔

ممکن ہے یہ "بزرگ" ہمارے ان سوالوں کا کوئی معقول جواب رکھتے ہوں۔ لیکن واقفان حال کہتے ہیں کہ مریم جمیلہ کو ایسے شخص کے ساتھ صرف اس لئے وابستہ کیا گیا کہ یہ شخص اپنے احساس کمتری کے باعث ہمیشہ کے لئے جماعت اسلامی سے وابستہ رہے۔ اور اگر مریم جمیلہ کی شادی کسی اعلیٰ تعلیم یافتہ برسر روزگار۔ اور حسین وجمیل کنوارے سے کر دی جاتی تو وہ کسی وقت

بھی ماہر چھوڑ کر باہر جا سکتا تھا۔ یا دیگر "گھر کے بھیدیوں" کی طرح جماعت ہی کو چھوڑ کر کنارہ کش ہو سکتا تھا۔ ایسی صورت میں ان پراسرار مقاصد کو نقصان پہنچنے کا شدید احتمال تھا جن کی تکمیل کے لئے ایک یہودی نژاد "لڑکی" مریم جمیلہ نے امریکہ سے پاکستان آنے کی زحمت اٹھائی ہے۔

مریم جمیلہ کے اس مختصر سے تعارف کے بعد اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں کہ مریم جمیلہ کے نام سے یہودی سازش نامی کتاب پر جو تبصرہ شائع ہوتا رہا ہے کیا وہ مریم جمیلہ کا اپنا تحریر کردہ ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو انگریزی کی ماہر اور اردو سے قطعی ناواقف غیر ملکی لڑکی کا نام اردو زبان میں شائع ہونے والے مضمون کے لئے استعمال کرنے میں کیا مصلحت تھی۔؟ اور اگر یہ مضمون اس کے انگریزی یا کسی دوسری زبان کا ترجمہ ہے تو مترجم کا نام کیوں ظاہر نہیں کیا گیا۔؟

نامعلوم اس پردہ پوشی اور ڈرامائی پہلو کے محرکات کیا ہیں؟

جماعت اسلامی نے مریم جمیلہ کی پاکستان میں آمد کے موقع پر پروپیگنڈا کیا تھا کہ موصوفہ نے مودودی صاحب کے لٹریچر سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا ہے اور انہیں اسلام سے والہانہ عشق ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان کے نام سے جو تحریریں جماعت اسلامی کے جرائد میں شائع کی جا رہی ہیں وہ مخصوص سیاسی نظریات کی حامل ہوتی ہیں اور خاص قسم کے سامراجی عزائم کی آئینہ دار ہوتی ہیں انہیں اسلام کی صداقت وحقانیت سے زیادہ سامراجی مفادات کے مطابق زیادہ عزیز ہیں۔ وہ اسلام کا نام ضرور لیتی ہیں۔ لیکن صرف اپنی

مخصوص سیاسی مصلحتوں کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کے لئے ---!

اخوان المسلمین اور صدر ناصر کی چپقلش کے موضوع پر قلم اٹھاتے وقت وہ ایک نومسلم خاتون نہیں بلکہ امریکی سامراج کی ایجنٹ دکھائی دیتی ہیں آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ نومسلم خاتون کی حیثیت سے اسلام، قرآن اور حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے موضوعات تک اپنا دائرہ تحریر کیوں محدود نہیں رکھتی ہیں؟

(ملاحظہ ہو جماعت اسلامی کا ترجمان ہفت روزہ ایشیا لاہور ۲۱ راگست ۱۹۶۶ء)

اور ---- اب یہودی سازش نامی کتاب پر تبصرہ و تجزیہ کے لئے اس کا نام استعمال کرنے میں آخر کیا مصلحت ہے؟ جماعت اسلامی کے کہنہ مشق انشاء پردازوں اور افسانہ نگاروں کی فوج ظفر موج آخر کس مرض کی دوا ہے۔ ان کے قلموں کے زہریلے نشتر کیا ان دنوں کند ہو گئے ہیں اور کارآمد نہیں رہے ہیں۔؟

ہمیں بتایا جائے کہ یہودی نژاد امریکی لڑکی پاکستان میں کس مشن پر تشریف لائی ہیں۔ کہیں اس کی آمد یہود و نصاریٰ کی سازش کے تحت عورتوں کے ذریعے خدمات انجام دلانے کا گھناؤنا کردار تو نہیں۔؟

اگر یہی یہودی نژاد لڑکی مودودی صاحب کی بجائے ہیں جمال عبدالناصر کے گھر چلی جاتی تو پھر آپ دیکھتے کہ جماعت اسلامی کے "صحافی پروپیگنڈا بازوں" کے جوہر کس جوبن پر ہوتے ہیں۔

مریم جمیلہ ------ ایک سیکنڈل ہے ------ اس کے حقیقی خدوخال سے ضرور نقاب اٹھنا چاہیئے۔ اور اس کی پراسرار سرگرمیاں ضرور نگاہ احتساب میں آنی چاہئیں۔ تاکہ اسلامیان پاکستان پھر کسی ابتلاء آزمائش میں مبتلا نہ ہو جائیں اور جماعت اسلامی کے حلقے میں ایک یہودی نژاد لڑکی کی آمد کے باعث "شکوک وشبہات" کی جو تاریک گھٹائیں چھا گئی ہیں ان سے مطلع ضرور صاف ہونا چاہیئے۔"

نظریۂ عرب قومیت اور وحدتِ اسلامی

متحدہ عرب جمہوریہ کے صدر جمال عبدالناصر کے خلاف سب سے بڑا پروپگنڈا یہ کیا جاتا ہے کہ نظریہ عرب قومیت یا عرب نیشنلزم (Arab Nationalism) کے داعی بن کر دورِ جاہلیت کا نعرہ بلند کر رہے ہیں اور اسطرح وہ تحفظ حرمت اتحادِ عالمِ اسلامی اور مسلم قومیت کے بالکل منافی رخ اختیار کر رہے ہیں۔ معترضین کے نزدیک عرب قومیت یا عرب نیشنلزم کا تصور مغربی مفکروں اور دانشوروں کی ذہنی و فکری اختراعات کا نتیجہ ہے اور اسطرح کے علاقائی مفادات کے تحفظ کے لئے اسلام کسی تحریک کی اجازت نہیں دیتا ہے!

معترضین کا موقف یہ ہے کہ دنیائے اسلام کی مشکلات اور انکی ہمہ گیر الجھنوں کا واحد حل علاقائی سطح کی تنظیمیں نہیں بلکہ اسلامی بلاک کا قیام ہے۔

اس مسئلہ کے حقیقی خدوخال معلوم کرنے اور تحقیقی تجزیہ کے لئے دو باتیں خصوصی توجہ اور غور و فکر کی محتاج ہیں۔

اولاً —— یہ کہ عرب قومیت یا عربوں کے علاقائی مفادات کے تحفظ کے لئے صدر ناصر اور ان کے ہمنواؤں نے جو تحریک شروع کر رکھی ہے اسکی دینی و اسلامی حیثیت کیا ہے؟ کیا اسلام علاقائی بنیاد پر مسلمانوں کو اپنے حقوق اور مفادات کے تحفظ کی اجازت دیتا ہے؟

ثانیاً —— یہ کہ اس مسئلہ کے بارے میں خود صدر ناصر کے اپنے تصورات اور نظریات کیا ہیں۔؟

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے۔ دنیا کا کوئی بھی صحیح العقیدہ مسلمان اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے خطہ عرب کو عربی زبان اور عرب قوم کو دنیا کے دیگر خطوں، زبانوں اور اقوام پر بہت بڑی فضیلت عطا فرمائی ہے۔ آخر کوئی تو خصوصیت اور اعزاز کی بات تھی جسکی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر، اپنی آخری کتاب، اور آخری رسول کے لئے خطہ عرب اور عربی زبان کو منتخب فرمایا۔

یہ فضیلت اور شرف معمولی نوعیت کا نہیں ہے جسے محض غیروں کی خوشنودی کے لئے نظر انداز کر دیا جائے۔ خطہ عرب کو اہل اسلام کی وحدت و مرکزیت کا نشان (SYMBLE) بنایا گیا ہے اور نماز پنجگانہ کے ساتھ ساتھ حج بیت اللہ کو فرزندان توحید کے اتحاد و یگانگت اور وحدت مرکزیت برقرار رکھنے کی دائمی تربیت کا ذریعہ۔ اور تجدید عہد کی عملی شکل قرار دیا گیا ہے۔

یہود و نصاریٰ اور دیگر دشمنان اسلام حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ حیات میں ہی اس کے لئے ساعی و کوشاں تھے کہ اسلام اور مسلمانوں

کی لازوال وحدت و مرکزیت کسی نہ کسی طریق سے ختم کردی جائے اور فرزندانِ جسور تفریق و انتشار کا شکار ہو کر بے یار و مددگار ہو جائیں۔

خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دشمنانِ اسلام کے مکروہ عزائم اور ان کی ناپاک سازشوں کو اسی وقت بھانپ لیا تھا اور ہمیشہ کے لئے ان کا سدِباب کرتے ہوئے فرمادیا۔

اخرجوا الیہود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب

یہود و نصاریٰ کو جزیرہ عرب سے نکال باہر کرو۔"

حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث مبارک اُمتِ محمدیہ کے نام آخری وصیت کے طور موجود ہے اور آپ کا یہ فرمان مبارک نفسِ مسئلہ کو سمجھنے کے لئے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امتِ محمدیہ کی وحدت و مرکزیت کے تحفظ اور جزیرہ عرب کو یہود و نصاریٰ کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں سے ہر طرح محفوظ و مصئون رکھنے کے لئے اپنی امت کو مستقلاً یہ ہدایت کردی کہ خطہ عرب میں ان دشمنانِ اسلام کو کسی صورت میں بھی اثر و نفوذ اور عمل دخل کا موقع ہی نہ دیا جائے!

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان مبارک کی حکمت اور مصلحت یہی معلوم ہوتی ہے کہ اگر یہود و نصاریٰ کے اثر و نفوذ سے اہلِ اسلام کا مرکز و محور خطہ عرب بچا رہے گا تو باقی دنیائے اسلام کا وجود بھی قائم رہ سکتا ہے اور اگر یہ مرکز ہی نہ رہ سکا تو انکی وحدت و مرکزیت اور "اسلامی

متحدہ بلاک" قائم کرنے کا وسیع منصوبہ کیونکر پایہ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے ؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی روشنی میں اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں قطعاً کوئی امر مانع نہیں ہونا چاہیئے کہ خطہ عرب کے مفادات باقی دنیائے اسلام کے مفادات سے بالکل مختلف ہیں۔ ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا بھر کے مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ ملحوظ رکھ کر یہ ضرور فرماتے کہ یہود و نصاریٰ کو دنیا سے نکال دو! یا کم از کم اسلامی ملکوں ہی سے نکالنے کے احکام جاری کیئے جاتے۔ اور "عرب خطے" کی بجائے اسلام کا نام استعمال کیا ہوتا۔ حالانکہ آپ کے زمانہ حیات میں پورا "جزیرہ عرب" مسلمانوں کے قبضہ و تحویل میں نہیں تھا۔ جس سے یہ نظریہ قائم کیا جا سکتا کہ جتنا علاقہ (ان دنوں) اسلام کے قبضہ تصرف میں موجود تھا آپ نے دشمنانِ اسلام کو وہاں سے نکال باہر کرنے کے احکامات جاری فرما دیئے اور باقی معاملہ آئندہ والے مسلم اربابِ اقتدار کے صوابدید پر چھوڑ دیا۔ کہ جوں جوں وہ خطہ زمین پر قابض ہوتے جائیں۔ یہود و نصاریٰ کو وہاں سے خارج کرتے جائیں گے۔

سوال یہ ہے کہ پھر جزیرہ عرب کی تخصیص اور حد بندی کی وجہ کیا ہے؟ کیا اسلام اور مسلمانوں کا دائرہ عمل صرف جزیرہ عرب تک محدود رہتا تھا۔؟ آپ نے "دنیائے اسلام" کا نام کیوں نہ لیا۔؟ تاکہ اُمتِ محمدیہ کو یہ نظریہ قائم کرنے میں روشنی ملتی کہ اسلام علاقائی بنیاد پر مفادات کے تحفظ کی اجازت دینے سے قاصر ہے۔

الغرض ــــــ یہ بات واضح ہو گئی کہ پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم

نے اپنے فرمان میں علاقائی حدبندی کر کے اس حقیقت کی وضاحت فرمادی کہ "خطہ عرب" کے مفادات دراصل عالم اسلام ہی کے مفادات ہیں۔ اور اگر یہ خطہ غیروں کے اثر و نفوذ سے بچا رہے گا۔ تو باقی اسلامی ملک بھی محفوظ رہ سکیں گے۔

علاوہ ازیں یہ کہ دنیا کے بعض مسائل صرف علاقائی سطح پر ہی طے پا سکتے ہیں۔ اور دنیا کے بیشتر ممالک ایسے ہیں جنہوں نے اپنے مخصوص مسائل حل کرنے کے لئے علاقائی تنظیمیں قائم کر رکھی ہیں! جیسا کہ میثاق استنبول (R.C.D) علاقائی تعاون کا ترقیاتی ادارہ) کا وجود ہے جسے پاکستان۔ ایران اور ترکی نے قائم کر رکھا ہے اور یہ بات موجب اطمینان ہے کہ یہ تنظیمی ڈھانچہ رکن ممالک کی تعمیر و ترقی میں قابل قدر خدمات انجام دے رہا ہے:-

بالکل اسی طرح صدر جمال عبدالناصر اور ان کے ہمنوا عرب سربراہوں نے بھی باہمی تنازعات دور کرنے اور وسیع تر اسلامی مفادات کی تکمیل اور حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری فرمان پر عمل پیرا ہوتے ہوئے "عرب قومیت" کا نعرہ بلند کر رکھا ہے۔ جیسطرح میثاق استنبول وحدت اسلامی کے منافی نہیں ہے۔ اسی طرح "عرب قومیت" کا نعرہ بھی عربوں کے اتحاد اور جزیرہ عرب کو یہود و نصاریٰ کی خلاف اسلام ریشہ دوانیوں۔ ناپاک سازشوں اور خطرناک سرگرمیوں سے محفوظ و مصعون رکھنے کی ضامن ہے۔ اور پھر جب مصر۔ سوڈان۔ الجزائر۔ مراکش وغیرہ ممالک افریقی ہونے کے باوجود

اپنے آپ کو عرب کہلانے پر فخر محسوس کرتے ہیں تو اسکی وجہ بھی اسلام ہی ہے اور ان ممالک کے لوگ اگر عرب قومیت کا نعرہ بلند کرتے ہیں تو اس سے ان کا منتہائے مقصود دراصل اسلام اور مسلمانوں ہی کی وحدت و مرکزیت کا قیام ہوتا ہے۔

جو کم فہم، اور بے بصیرت لوگ عربوں کے اتحاد اور نعرۂ "عرب قومیت" کو اسلامی نظریہ حیات کے خلاف سمجھتے ہیں۔ انہیں اس مسئلہ پر نظر ثانی کرتے ہوئے اس بات کی فکر کرنی چاہیئے کہ پیغمبر آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی دانستہ یا نادانستہ خلاف ورزی کا ارتکاب تو نہیں کر رہے ہیں؟ اور جزیرۂ عرب کو یہود و نصاریٰ کے اثرات سے بچانے کے لیئے آپ نے جو آخری وصیت فرمائی تھی۔ اسکی مصلحتوں اور حکمتوں کو نظر انداز کر کے خطۂ عرب میں یہود نصاریٰ کے مادی مفادات کا تحفظ کر کے ان کی گرفت مضبوط تر تو نہیں کر رہے ہیں؟

جہاں تک صدر جمال عبدالناصر کے اپنے تصورات و نظریات کا تعلق ہے کہ عرب قومیت اور "عرب نیشنلزم" کے داعی اور علمبردار کی حیثیت سے وہ اپنے ذہن میں عربوں یا اہل اسلام کے بارے میں کیا خاکہ رکھتے ہیں ۔۔ ؟ اور حصول مقصد کے لئے وہ کونسا طریق کار اپنے لئے مفید اور نتیجہ خیز سمجھتے ہیں۔ اس کا اظہار انہوں نے اپنی مشہور تصنیف "فلسفہ انقلاب" میں بڑی وضاحت سے کیا ہے۔

ہم یہاں پر اسلام اور مسلمانوں سے ناصر کی والہانہ شیفتگی کے اظہار

کے لئے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں جس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ناصر کیمونسٹ یا ملحد نہیں بلکہ وہ اسلام کے شیدائی اور پکے مسلمان ہیں وہ لکھتے ہیں
ہماری سرگرمیوں کے تین دائرے ہیں۔ پہلا دائرہ عربی دائرہ ہے۔ ہم مجبور ہیں کہ اس دائرہ کے اندر وہ گردش کریں اور پوری قوت کیساتھ سرگرم عمل ہوں۔ اسکے بعد دوسرا دائرہ ہے۔ یہ افریقی دائرہ ہے۔ جسکے بارے میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ ہم لوگ چاہیں تو اس ہولناک اور خونریز کش مکش سے کسی حالت میں علیحدہ نہیں ہو سکتے جو عین قلب افریقہ میں ۵۰ لاکھ گوروں اور بیس کروڑ افریقیوں کے درمیان جاری ہے۔ سبب بالکل واضح ہے ہم خود اسمیں رہتے ہیں۔ اور اہل افریقہ کی نگاہیں ہماری طرف لگی رہیں گی اس براعظم میں شمالی دروازے کے پاسبان بھی ہم ہیں اور بیرونی دنیا کے ساتھ ان کے ربط وارتباط کا راستہ بھی ہمیں ہیں۔ ایسی حالت میں ہم کسی صورت میں بھی اپنی اس ذمہ داری سے پہلو تہی نہیں کر سکتے جو افریقہ کے وحشت آباد علاقوں اور تاریک جنگلوں تک تہذیب وتمدن کی روشنی پھیلانے میں حتی الامکان مدد پہنچانیکے سلسلہ میں ہمارے سر عائد ہوتی ہے۔ اسکے علاوہ ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ دریائے نیل جو ہمارے وطن کیلئے رگ جاں کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اسی براعظم کے قلب سے پانی حاصل کرتا ہے پھر ایک سبب اور بھی ہے کہ سوڈان ــــ جو ہمارا محبوب بھائی ہے ــــ اسکی سرحدیں قلب افریقہ تک چلی گئی ہیں اور وسط افریقہ کے تمام حساس اور بیدار علاقوں کے ساتھ

اس کا ہمسائیگی کا رشتہ قائم ہے۔

میں اس بات کو پھر دہراتا ہوں کہ آج افریقہ ایک عجیب ہیجان انگیز انقلابی کش مکش کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اور وہ گورا جو یورپی حکومت کا ترجمان ہے افریقہ کے نقشہ کو ایک بار پھر تقسیم کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ لہٰذا اس وقت افریقہ میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس کو ہم کسی حالت میں بھی محض موقع تماشائی بن کر نہیں دیکھ سکتے۔ یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ان مسائل سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں یا ان کا کوئی اثر ہم پر نہیں پڑے گا۔ میں تو اس دن کا خواب دیکھ رہا ہوں۔ جب قاہرہ میں ایک عظیم الشان افریقی ادارہ عمل میں مصروف کار ہوگا جس کی محنتوں سے افریقہ کے تاریک ترگوشے اور انکی قدرتی صلاحیتیں ہماری نظروں کے سامنے بے نقاب ہوں گے اور ایک روشن افریقی احساس و شعور ہمارے قلوب میں پیدا ہوگا۔ وہ ادارہ جو دنیا کے دوسرے ارباب عمل کے اشتراک و تعاون سے اس بر اعظم کی ترقی اور فلاح و بہبود کی سرگرمیوں میں منہمک ہوگا۔

اب رہا تیسرا دائرہ ـــــ یہ دائرہ وہ ہے جس کے دامن میں بر اعظموں اور سمندروں کی حد بندیاں سمٹی ہوئی ہیں۔ یہ دائرہ ہمارے ان تمام دینی بھائیوں کا ہے۔ جو دنیا کے کسی خطہ میں بھی ہوں۔ اس سورج کے نیچے ایک ہی قبیلے کی طرف ہمارے ساتھ جھکتے ہیں۔ اور انکے ہونٹوں پر بھی خضوع و خشوع کی وہی دعائیں اور وہی درود و سلام ہوتے ہیں جو ہمارے ہونٹوں پر ہیں۔ ـــــ سچ تو یہ ہے کہ جب مملکت سعودیہ کے تاجدار کی وفات پر تعزیت کے لئے حجاز گیا تھا تو وہاں

پہنچ کر اس موثر ایجابی قوت کی تخلیق اور اسکی وسعت پر میرا ایمان اور بھی محکم ہو گیا جو مسلمانانِ عالم کے باہمی رشتۂ اسلامی کی بنیاد پر روبہ عمل آسکتی ہے۔

میں خانہ کعبہ کے سامنے کھڑا تھا اور میرا تصور دنیا کے ان تمام خطوں اور دور دراز گوشوں کا طواف کر رہا تھا۔ جہاں اسلام پہنچا ہے۔ پھر میں نے اپنے آپ کو بے اختیار دل ہی دل میں کہتے پایا ـــــ کہ حج کے متعلق ہمارے نظریہ میں اب تبدیلی ہونی چاہیئے۔ سفر کعبہ کا مطلب یہ تو ہرگز نہ ہونا چاہیئے کہ یہ ایک درازمدت کے بعد جنت میں داخل ہونے کا پاسپورٹ ہے یا عیش وعشرت کی بھرپور زندگی گزار چکنے کے بعد "عقیدائی مغفرت" کی ایک بھولی بھالی کوشش ـــــ ہونا یہ چاہیئے کہ حج ایک عظیم سیاسی قوت بن جائے۔ ایسی قوت کہ دنیا کے تمام اخبارات اس اجتماع کی خبریں حاصل کرنے کے لئے دلہانہ وار لپکیں۔ اس لئے نہیں کہ مناسک و رسوم کی تصویریں اپنے قارئین کے لئے تفریح کا سامان فراہم کریں بلکہ اس لئے کہ حج ایک ایسا باقاعدہ سیاسی اجتماع ہے جس میں تمام ممالک اسلامیہ کے قائدین ارباب فکرونظر محققین علوم و ماہرین فنون۔ اہل قلم۔ ماہرین صنعت و حرفت ماہرین تجارت اور ان تمام ملکوں کے نوجوان ـــــ سب کے سب پاس مقدسہ میں جمع ہوں کہ وہ اس عالمی اسلامی پارلیمان میں اپنے ملکوں کی سیاست اور باہمی امداد و تعاون کی ایک وسیع پالیسی مرتب کریں اور پھر ہر سال اس عظیم الشان اجتماع میں اپنا پورا جائزہ لیں۔

یہاں ان سب کا اجتماع حد درجہ منکسرانہ اور عاجزانہ ہوگا۔ لیکن یہ اسی طرح توی بھی ہوں گے حرص و ہوس سے پاک اور جوش عمل سے لبریز اپنے خدا کے حضور

میں عاجز و ناتواں لیکن اپنی الجھنوں مشکلوں اور دشمنوں کے حق میں حد درجہ سخت کوش و سخت گیر حیات اخروی اور زندگانی نو کے آرزومند لیکن ساتھ ہی اس ایمانی و ایقان سے بھی معمور کہ اس سورج کے نیچے بھی انکا ایک مقام ہے اور اس مقام کا حق انکو اسی دنیا کی زندگی میں ادا کرنا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنے جذبات و احساسات کا کچھ اظہار جلالۃ الملک سعود کے سامنے بھی کیا تھا تو انہوں نے میری باتیں سن کر فرمایا۔ بلاشبہ حج کی حقیقی حکمت یہی ہے ـــ اور واقعی اس کے سوا دوسری اور کوئی حکمت میرے تصور میں نہیں آسکتی"۔ ـــــــ فلسفۂ انقلاب

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ صدر ناصر کے ذہن میں انقلاب کی تکمیل کے تین مرحلے ہیں۔ پہلا مرحلہ "حربی" ہے یعنی طاقت کے ذریعہ اقتدار کا حصول اور اس کا تحفظ ـــ: دوسرا مرحلہ مشرق وسطی اور افریقیائی ممالک سے سامراجی طاقتوں کے اثر و نفوذ کا خاتمہ۔ تیسرا آخری مرحلہ اسلام اور مسلمانوں کی مرکزیت کا قیام ہے ـــ: اور یہی نکتہ دراصل آپکی زندگی کی ساری جد و جہد کا مرکز و محور ہے۔

صدر ناصر مصر سے ملوکیت کو ختم کر کے پہلے مرحلہ کو خوش اسلوبی سے طے کر چکے ہیں۔ اب وہ دوسرے مرحلہ میں ہیں اور مشرق وسطی سے گوئے سامراجیوں کی بالادستی ختم کرنے کے لئے انہوں نے زندگی اور موت کی بازی لگا رکھی ہے۔ فی الحقیقت یہی مرحلہ بہت زیادہ کٹھن اور مصائب و آلام سے پُر ہے۔ سامراجیوں کی مذموم خواہش ہے کہ اسی دوسرے مرحلہ میں انہیں ختم

کر دیا جائے تاکہ تیسرے روشن اور تابناک مرحلے تک پہنچنے کی نوبت ہی نہ آئے
چنانچہ اسرائیل کا حملہ اسی ناپاک منصوبہ کی ایک کڑی ہے۔

سامراجی طاقتیں اور ان کے ہمنوا اس شرمناک پروپیگنڈے کو خوب ہوا
دے رہے ہیں۔ کہ عربوں کی شکست کا واحد ذمہ دار صرف صدر ناصر ہے۔ لیکن
واقعہ یہ ہے کہ سامراجیوں نے جہاں اسرائیل کی پیٹھ ٹھونک کر اس سے جارحیت
کا ارتکاب کروایا ہے۔ وہاں صدر ناصر کو داخلی مشکلات میں مبتلا کرنے کے لئے
بعض مقتدر فوجی جرنیلوں کو بھی خرید لیا ـــــ چنانچہ صحرائے سینا اور غزہ
کے محاذوں پر سی۔آئی۔اے کے ان حرام خور ایجنٹوں نے عین وقت پر
غداری کا شرمناک مظاہرہ کر کے اسرائیلی یلغار کو روکنے سے پہلو تہی اختیار
کی۔ اس گھناؤنے اور شرمناک کردار کے ذریعہ بظاہر صدر ناصر کی ذلت و رسوائی
مقصود تھی ـــــ لیکن یہ ایک المناک حقیقت ہے کہ اس گھناؤنی سازش
کے باعث عربوں کی شکست کے گہرے اور بھرپور زخموں نے پوری ملت اسلامیہ
کو نڈھال کر کے رکھ دیا ہے اور آئندہ بھی سامراجیوں کے اشارہ ابرو پر صدر ناصر
یا مصر کو ذلیل کرنے کی جو جو ناپاک کوشش کی جائے گی اس کی ضرب رسانیوں
سے صرف ناصر یا مصر ہی متاثر نہ ہوں گے بلکہ پوری دنیائے اسلام کا اس کی
خطرناکیوں اور مضرتوں کی لپیٹ میں آ جانے کا سخت اندیشہ ہے (خداوند قدوس
ملت اسلامیہ کو ایسے شرور و فتن سے محفوظ رکھے)

معترضین کے نزدیک "فلسفہ انقلاب" پر سب سے بڑا اعتراض یہ بھی ہے
کہ ناصر نے اپنے انقلابی پروگرام میں دنیائے اسلام کے اتحاد کو تیسرے مرحلہ پر

کیوں جگہ دی اور ابتدائی دو مرحلوں کو اپنی توجہ کا مرکز کیوں بنایا۔ ؟

معترضین کی بصیرت اگر امریکی ڈالروں نے مسخ نہیں کر دی ہے تو یہ معمولی سی بات انکی سمجھ میں آ جانی چاہیئے تھی کہ کسی بھی اہم کام کی تکمیل کے لئے ابتدائی مشکلات پر قابو پانا ضروری ہوتا ہے۔ اور صدر ناصر نے بھی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے راہ کی تمام رکاوٹوں کو دور کرنا ضروری سمجھا اور اپنے منصوبہ کو ایسی عمدگی سے ترتیب دیا کہ تمام سامراجی ممالک اس کے دور رس نتائج کی شدت کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکے۔

صدر ناصر عرب قومیت کا نعرہ بلند کر کے دراصل سرزمین عرب (فلسطین) میں امریکہ، برطانیہ، جرمنی اور دیگر ممالک سے آکر آباد ہونے والے اور غاصبانہ قبضہ کرنے والے یہودیوں کو خارج کرنا چاہتے ہیں۔

صدر ناصر کا یہ نعرہ دراصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مقدس فرمان کی عملی تفسیر ہے کہ یہود و نصاریٰ کو سرزمین سے نکال باہر کیا جائے۔

عجیب بات ہے کہ عرب قومیت کے جس تصور کی کامیابی میں یہودیوں کی موت کا راز مضمر ہے۔ اسے جماعت اسلامی خود اسلام کے بنیادی اصولوں ہی کے منافی قرار دیتی ہے۔ حالانکہ اسلام کے ان "نئے مفسروں" کی اپنی کیفیت یہ ہے کہ ان لوگوں نے زمانہ جاہلیت کے نسبی اور نسلی تفاخر (مودودی خاندان) کو اپنے نام کا جزوِ اعظم بنا رکھا ہے۔ اور حصول اقتدار کی خاطر ہر ترازو میں تل جانے والے اسلام کے نام پر کام کرنے کی بجائے بنیادی جمہوریت کے مقابلہ میں "بحالی جمہوریت" کی تحریک شروع کر رکھی ہے۔

ہوس اقتدار کا بُرا ہو کہ جماعت اسلامی اب سو فیصد غیر اسلامی ماحول میں ٹھوکریں کھا رہی ہے اور "صالح قیادت" بروئے کار لانے کے علمبردار قیادت فاسقہ پر ہی اکتفا کئے بیٹھے ہیں۔ بحالی جمہوریت کے دیگر رہنماؤں نے اپنے پروگرام کی وضاحت میں اسلام کا نہ تو کبھی نام لیا ہے اور نہ ہی اعلیٰ و ارفع دینی مقاصد کے حصول کا کبھی اعلان ہی کیا ہے۔ لیکن پھر بھی بزعم خود صالحین کا یہ طائفہ دل و جان سے اس تحریک کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔ آخران رہنماؤں نے آٹھ نکاتی پروگرام کی تحریک کو مشرقی پاکستان کے علاقائی مفادات کے تحفظ کے لئے کیوں شروع کر رکھا ہے۔ اس میں اسلام کا نام کیوں نہیں لیا جاتا؟ اور جو شخص پاکستان میں اسلامی نظام رائج کرنے سے مخلصانہ جذبات رکھتا ہے اس کے لئے اور کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ وہ ملک کے دیندار اور مذہبی حلقے کا ایک اسلامی محاذ قائم کرکے صرف بحالی اسلام کی تحریک چلائے اور اگر اسلامی نظام قائم ہو گیا تو جمہوریت خود بخود بحال ہو جائے گی ورنہ مغربی طرز کی جمہوریت کا تو انقلاب ۱۹۵۸ء سے قبل یہاں ایسا نام نہاد جمہوری نظام رائج تھا۔ تو اس سے نظام اسلام کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ اس تحریک کے نظام کار کو جہاں تک ہم سمجھتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ یہ لوگ غالباً اسے نظام اسلامی کے نفاذ کے لئے پہلا مرحلہ اور ذریعہ قرار دیتے ہیں۔

سو! ادب نہ ہو تو پوچھا جا سکتا ہے کہ اگر اسلام کا نام لئے بغیر بحالی جمہوریت کی تحریک میں شامل ہونے سے نظام اسلامی کے قیام کی تحریک کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا ہے بلکہ ان کے نزدیک الٹا فائدہ حاصل ہونے کا امکان ہے اور

اور جماعت اسلامی اسے منزل مقصود تک پہنچنے کا ذریعہ اور ابتدائی اقدام سمجھتی ہے تو پیر صدر ناصر اور عربوں کا کیا گناہ ہے کہ اسے مسلمانوں کی وحدت و مرکزیت اور اسلامی اتحاد تک پہنچنے کا ابتدائی قدم اٹھانے، اور حصول مقصد کا ذریعہ اختیار کرنے پر ملامت کی جائے اور نظریہ عرب قومیت کا کیا قصور ہے کہ اسلام کے لئے مہلک قرار دیا جائے! اور جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے" کے مصداق جماعت اسلامی کی طرف سے اپنی توام بہن "اخوان المسلمین" کے انداز کار اور اسلام کے بقاء و احیاء کے لئے اسکی معرکہ آرا خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا جاتا ہے

"اس میں شک نہیں کہ اخوان المسلمین نے مصر کو غیر ملکی سامراج سے آزاد کرانے اور "عرب، اتحاد" کے حصول کے لئے لادین عربی قوم پرستوں سے اشتراک و اتفاق کیا۔ لیکن کامیابیاں بجائے خود ان کے لئے کوئی مقصدی حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔ بلکہ حصول مقصد کا ذریعہ تھیں "عرب اتحاد" تو "اسلامی اتحاد" کی جانب ایک قدم تھا اور غیر ملکی سامراج سے نجات کے بعد وہ موقع حاصل ہوتا تھا جس کے بعد ایک اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی جا سکتی تھی۔ (ہفت روزہ ایشیا لاہور ۲۱ اگست ۱۹۶۹ء)

تعجب کی بات یہ ہے کہ جس اقدام کو جماعت اسلامی اپنے اور اخوان المسلمین کے لئے جائز و مباح سمجھتی ہے اور اسے حصول مقصد کا واسطہ اور ذریعہ قرار دیتی ہے۔ اتحاد اسلامی کے لئے وہی ذریعہ اور واسطہ (اتحاد عرب) اگر صدر جمال عبدالناصر اختیار کرے تو حرام کا مرتکب

اتحادِ ترکی اور اتحادِ عالمِ اسلامی

کسی صحیح الفکر مسلمان کو اس حقیقت کے اعتراف میں مجالِ انکار نہیں ہے کہ دشمنانِ اسلام کی اجتماعیت اور ان کے اتحاد کے مقابلہ میں اہلِ اسلام کے بقا و احیاء کا واحد طریق کار یہ ہے کہ ان کے اتحاد اور اجتماعیت کے لئے عالمِ اسلام کی وحدت قائم کی جائے لیکن ساتھ ساتھ دشمنوں کی سازشوں اور چالبازیوں سے بھی پوری طرح باخبر ہونا چاہئے تاکہ خلوص کے ساتھ ہی اعداء اسلام کی تقویت کا سامان فراہم نہ ہو جائے جیساکہ ---------- "یہودی سازش" میں شائع شدہ ظفر احمد انصاری کے انٹرویو کی یہ معلومات خصوصی توجہ کی محتاج ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

"ترکی کے اندر ایک تنظیم قائم ہوئی جس کا نام انجمن "اتحادِ ترکی" رکھا گیا زیادہ تر اس میں بھولے بھالے سادہ لوح ترک نوجوان تھے اس انجمن کے اجتماعات کے لئے "فری میسن لاج" تھے۔ ان نوجوانوں کو جذباتی نعرے سے گرمایا گیا۔ اور ان میں عربوں کے خلاف اتنی نفرت پیدا کردی کہ آگے چل کر یہ نفرت ایک کوہِ آتش فشاں ثابت ہوئی۔ اس تنظیم کے ہاتھوں خلافت کی رو تار تار ہوئی اور پھر عالمِ اسلام ایک ایسے انتشار کا شکار ہو گیا کہ اتحاد کی تمام تحریکیں بے اثر ثابت ہوئیں!"

(اردو ڈائجسٹ نومبر ۱۹۶۶ء ص ۵۳)

یہ معلومات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ سامراجی ایجنٹ انجمن اتحاد

ترکی" کے مقدس نام پر" ایک گہری سازش کے ذریعہ خلافت کی قبا چاک کر سکتے ہیں اور سادہ لوح نوجوانوں کو جذباتی نعرے دیکر انہیں خوب گرما سکتے ہیں اور اتحاد کے نام پر ہی عالم اسلام کو انتشار کا شکار کر سکتے ہیں تو ---- اس بات کی کیا ضمانت دی جا سکتی ہے کہ صدر ناصر کے" نعرۂ عرب قومیت" کے خلاف " اتحاد عالم اسلامی" اور رابطہ عالم اسلامی کے مقدس ناموں پر جو تحریکیں چلائی جا رہی ہیں وہ" یہودی سازش" کا حصہ نہ ہوں جیسے بقول ظفر احمد انصاری ترکی میں" اتحاد ترکی" ہی کے نام سے جماعت بنا کر اور عربوں کے خلاف زبردست پروپیگنڈا کر کے خلافت عثمانیہ کی اسلامی مرکزیت تباہ کر ڈالی گئی اور خطہ عرب میں چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم کر کے اہل اسلام کے حصے بخرے کر دیئے گئے تو عربوں کے خلاف جو نفرت انگیز مہم چلائی جا رہی ہے اور صدر جمال عبدالناصر کو مطعون کر کے عالم اسلام میں اسے ذلیل و رسوا کرنے کا جو گمراہ کن پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے اسے عالم اسلام کے اتحاد" اور مسلمانوں کی وحدت کے خلاف" یہودی سازش" کیوں نہ سمجھا جائے

عرب ممالک اور پاکستان کی خارجہ پالیسی

قیام پاکستان کے بعد غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ یہاں کے اربابِ اختیار نے خارجہ پالیسی صحیح رُخ سے ترتیب دی ہے اور دُنیا کے مختلف ممالک سے روابط قائم کرنے میں اعتدال و توازن ملحوظ رکھا ہے۔ بالخصوص یہ پہلو نہایت دُور رس نتائج کا حامل ہے کہ ایک نازک، وقت میں اپنے مسلمان عرب بھائیوں کی پُوری فراخدلی کے ساتھ تائید و حمایت کی گئی ہے ۱۹۵۶ء میں جبکہ برطانیہ، فرانس اور اسرائیل نے اپنی بھرپُور فوجی طاقت کے بل بوتے پر سرزمین مصر اور نہر سویز پر غاصبانہ قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو صدر ناصر کی قیادت میں اہلِ مصر نے کمال جرأت ایمانی کا مظاہرہ کر کے ان سامراجیوں کے خطرناک حملہ کو ناکام بنا دیا تھا اور پورٹ سعید پر ان مجاہدین اسلام نے اپنے خون کی ندیاں بہا کر دشمنانِ اسلام کی جبروتی طاقت کا بھرکس نکال دیا تھا۔

اس دور میں چونکہ پاکستان میں سامراجیوں کے نمک خوار اور ان کے چاپلوس افراد برسراقتدار تھے۔ اس لئے انہوں نے پاکستانی عوام کے جذبات و احساسات اور عربوں کے ساتھ ان کی والہانہ شیفتگی و محبت کو نظر انداز کر کے حملہ آور سامراجیوں کی تائید و حمایت کی تھی حتٰی کہ ایک وزیر اعظم نے یہاں تک فرمایا تھا کہ اسرائیل ——— کی لاکھوں آبادی کو سمندر میں نہیں دھکیلا جا سکتا! آخر انہیں بھی زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔

ارباب حکومت کا فیصلہ چونکہ عوام کے رجحانات کا آئینہ دار ہوتا ہے اس لئے عرب ممالک خصوصاً مصری عوام اور وہاں کے ارباب اقتدار پاکستان کے بارے میں نہ تو اچھے خیالات رکھتے تھے اور نہ ہی ان کے دوستداری اور اخوت کے مراسم قائم رہ سکے۔ تاآنکہ ۱۹۵۸ء کا انقلاب برپا ہو گیا اور صدر محمد ایوب خاں نے ملک کی خارجہ پالیسی جانبداری کی بجائے غیر جانبدارانہ بنیادوں پر استوار کی تاکہ ملک کی تعمیر و ترقی محض ایک بلاک کی رضا و عدم رضا کے رحم و کرم پر نہ رہ جائے۔ پاکستان کی نئی خارجہ پالیسی وضع کرنے کے بعد صدر مملکت محمد ایوب خاں نے متحدہ عرب جمہوریہ کے صدر جمال عبدالناصر کو پاکستان کے دورہ کی دعوت دی۔ چنانچہ ملکی تاریخ کا یہ باب ہمیشہ تابناک رہے گا کہ صدر جمال عبدالناصر کی پاکستان میں آمد کے بعد دو اسلامی ملکوں کے درمیان نہ صرف رشتۂ اخوت و مودّت مضبوط تر ہو گیا ہے بلکہ اس میں شب و روز اضافہ ہو رہا ہے۔

پاکستان کی اس نئی خارجہ پالیسی کی بدولت جہاں مغربی ممالک سے روابط

قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ چین سے تعلقات کا ایک مضبوط و مستحکم سلسلہ قائم ہُوا۔ وہاں اسلامی و دیگر افریشیائی ممالک سے بھی پاکستان کے تعلقات میں نہایت خوشگوار اضافہ ہُوا۔

ظاہر ہے کہ اسلام دشمن طاقتیں "وسیع تر مفادات" کے یہ تعلقات کسی طرح برداشت نہ کر سکتی تھیں۔ اس لئے انہوں نے اپنی روایتی ڈپلومیسی سے کام لیتے ہوئے ڈرامائی انداز اور غیر محسوس (PIECEFUL PENETRATION) طریق سے مختلف اخبارات، افراد اور جماعتوں کے ذریعہ پروپیگنڈے کی ایک مہم شروع کرائی۔ جس سے ان سامراجی ملکوں کو یہ تاثر دیا جاسکے کہ ۱۹۵۶ء میں حکمران پارٹی عربوں کے مفادات کے مخالف تھی اور ملک کے عوام کی تمام تر ہمدردیاں عربوں کے ساتھ تھیں۔ لیکن ۱۹۶۷ء کی اسرائیل عرب جنگ میں پاکستان کے ارباب اقتدار اگرچہ اہل مصر اور دیگر عرب ممالک کے مفادات کے حامی اور ان کے موقف کے زبردست مؤید ہیں۔ لیکن پاکستان کی اس نئی خارجہ پالیسی کو عوام کی تائید و حمایت حاصل نہیں ہے۔ اس غلط تاثر کو فروغ دینے کے سلسلہ میں مختلف عرب ممالک اور خصوصاً متحدہ عرب جمہوریہ اور صدر ناصر کے خلاف جماعت اسلامی نے نہایت گھناؤنا اور مکروہ کردار ادا کیا اور غلط پروپیگنڈے کی زہریلی اور گمراہ کن مہم بدستور جاری ہے۔

جماعت اسلامی اور اس کے قائد جناب مودودی صاحب امریکی اور دیگر سامراجی پروپیگنڈے کی تائید و حمایت کرنے پر اپنے اخبارات و رسائل اور دیگر ذرائع نشر و اشاعت اس لئے وقف کئے ہوئے ہیں تاکہ عرب ممالک

کے "اتحاد و یگانگت" کے بعد اسلامی اتحاد" کے قیام میں رکاوٹیں پیدا ہو جائیں اور سامراجیوں کو بلا کسی روک ٹوک اپنے مکروہ عزائم کی تکمیل کے لئے مواقع فراہم ہو جائیں ورنہ کیا وجہ ہے کہ وہ اسلامی ملکوں کے باہمی عارضی اختلاف کو ختم کرکے اسلام دشمن طاقتوں کی ظالمانہ جارحیت واستبداد کے خلاف کوئی مہم شروع نہیں کرتے ہیں اور جس طرح تلاش بسیار کے بعد وہ متحدہ عرب جمہوریہ اور دیگر عربوں کے عیوب اور ان کی کوتاہیاں اُجاگر کرکے عوام کے دلوں میں اسلامی ملکوں اور خصوصاً عربوں کے خلاف حقارت کے بیج بو رہے ہیں وہ یہودیوں، عیسائیوں اور ان اسلام دشمن سامراجی طاقتوں کے خلاف کیوں سرگرمی کا اظہار نہیں کرتے حالانکہ عربوں کے بارے میں پاکستان کی خارجہ پالیسی کی تائید کرتے ہوئے امیر جماعت اسلامی جناب مودودی صاحب نے فرمایا ہے۔

"صدر ایوب نے اس جنگ کے موقع پر جو موقف اختیار کیا وہ نہایت صائب اور مبنی برانصاف تھا اور ہم نے اس معاملہ میں اپنی حکومت کی کسی قسم کی کوئی کوتاہی یا غفلت محسوس نہیں کی۔ جنرل اسمبلی میں بھی ہمارے نمائندوں نے عربوں کی حمایت میں پوری حق گوئی و بے باکی سے کام لیا۔"

(ہفت روزہ ایشیاء لاہور ۲ جولائی ۱۹۶۷ء)

جب مودودی صاحب پاکستان کی خارجہ پالیسی کو صائب اور مبنی برانصاف سمجھتے ہیں تو پھر صدر کے جاری کردہ "عرب ریلیف فنڈ" کے مقابلہ میں انہوں نے "اردن ریلیف فنڈ" قائم کرکے جانبداری کا ثبوت کیوں دیا؟ اور

ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنانے میں آخر کیا مصلحت کارفرما ہے؟ کیا پاکستان کے ارباب اقتدار نے بھی عربوں کے درمیان امریکی اور روسی بلاکوں کی تفریق کی ہے؟ اور جماعت اسلامی کی طرح صرف امریکی بلاک میں شریک عرب ممالک کی تائید کرتے ہوئے دوسرے بلاک سے تعلق رکھنے والوں کو ملحد بے دین اشتراکی اور اسلام دشمن قرار دیا ہے۔ کیا پاکستان کے ارباب اقتدار نے بھی "یہودی سازش" نامی کتاب کی اشاعت کر کے صدر ناصر کو یہودیوں کا ایجنٹ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر نہیں تو عجیب بات ہے کہ حکومت پاکستان کی پالیسی کو صائب اور مبنی برانصاف بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کی جڑیں بھی کاٹی جارہی ہیں۔

اگر جماعت اسلامی اور دیگر سامراجی ہمنواؤں کے بقول صدر ناصر "یہودیوں کے آلہ کار ہیں۔ تو اس کی زیر قیادت لڑی جانے والی جنگ کو مودودی صاحب نے کس طرح جہاد قرار دے دیا اور دیگر عرب سربراہان مملکت کے ساتھ ساتھ متحدہ عرب جمہوریہ کے صدر جمال ناصر کی اپنی تائید و حمایت کا یقین دلاتے ہوئے اسرائیل کے خاتمے تک جہاد "جاری رکھنے کی اپیل کیوں کی؟ (ایشیا ۱۸ جون ۱۹۶۷ء)

یہ مسجد ہے یہ میخانہ، مجھے اس پر تعجب ہے!
جناب شیخ کا نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

آخر مودودی صاحب دو کشتیوں میں سوار ہو کر کس طرح منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں انہیں دو رخی پالیسی ترک کر دینی چاہیے۔

سفیر متحدہ عرب جمہوریہ کا مکتوب
مولانا سیّد اسعد مدنی کے نام

اسلامیان عرب بالخصوص صدر جمال عبد الناصر کے خلاف سامراجیوں کے گمراہ کن پروپگینڈے کی ہمہ گیر مہم کا دنیائے اسلام کے ذی بصیرت و فراست مسلمانوں نے ہر جگہ دندان شکن جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ پاکستان کے علاوہ بھارت کے مسلمانوں نے بھی اس سلسلہ میں لائق تحسین خدمات انجام دی ہیں اور اپنی حمیت اسلامی و غیرت ملی کا جو شاندار مظاہرہ کیا ہے عالم اسلام میں یقیناً اس کے اچھے اثرات مرتب ہوں گے اور اہل اسلام میں اخوت و محبت کی فضا پیدا ہوگی

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ کے خلف الرشید حضرت مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ العالی نے عربوں کے خلاف سامراجی پروپگینڈے کی حقیقت بذریعہ خط و کتابت معلوم کرنے کیلئے متحدہ عرب جمہوریہ مصر کے سفیر متعینہ بھارت سے بذریعہ خط و کتابت رابطہ قائم کیا تو انہوں نے صورت حال کے صحیح خد و خال واضح کرکے گمراہ کن پروپگینڈے کے تار و پود بکھیرے ہیں

انہوں نے سید اسعد مدنی ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند کے نام اپنا جو مکتوب ارسال کیا ہے ۔ اسکی افادیت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ حضرات کی معلومات میں اضافے کے طور پر یہاں بھی پیش کر دیا جائے ۔

برادر محترم سید اسعد مدنی ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند

ہم اس موقعہ پر آپ کا اور جمعیۃ علماء ہند کا شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ آپ نے اہل عرب کے انصاف پسند موقف اور مبنی بر حق مسائل میں دینی اخوت کا پاس رکھتے ہوئے برادرانہ احساسات ۔ سچی مخلصانہ کوششوں اور سرگرم تائیدوں سے عربوں کی حمایت و مدد کی ہے ۔ اس طرح جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ آپ نے متحدہ عرب جمہوریہ کے سیاسی موقف کی وضاحت کے لئے مخلصانہ کوششیں کی ہیں ۔ تو ہم دوبارہ آپ کا شکریہ ادا کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ۔ اس شکرگزاری کے ساتھ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہمارے مسلمان بھائیوں کے سامنے یہ بات بھی وضاحت سے آجانی چاہیئے کہ

(۱) متحدہ عرب جمہوریہ نے آج تک عرب عوام کی مشکلات کا علاج تلاش کرنے کے سلسلہ میں جتنی بھی کوششیں کی ہیں ۔ ان کی اصل بنیاد عوام کے درمیان عدل و انصاف کی اشاعت اور ان کے باہمی تعلقات کو خوشگوار بنانیکی جدوجہد پر ہے ۔ متحدہ عرب جمہوریہ کی یہ کوشش رہی ہے کہ اجتماعی ظلم و ستم اور استعماریت کے خلاف جتنی بھی مساعی کی ہیں ۔ وہ سب دین حنیف کی روح کو سمجھنے کے بعد کی ہیں ہمارے دین نے انسان کی شخصی اور انفرادی برتری کو بجا طور پر تسلیم کر لینے کی اہمیت کو واضح کیا ہے وہ معاشرہ کے افراد پر بے جا ظلم و تعدی

کو پسند نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے خلاف جدوجہد کی ہدایت کرتا ہے۔
متحدہ عرب جمہوریہ کے یہ افکار قرآن کریم اور حدیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نصوص و تصریحات کی روشنی میں قائم کئے گئے ہیں۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے
وانفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ :۔ اس میں سے خرچ کرو کہ اللہ کریم نے تمہیں دولت کے معاملہ میں خلیفہ بنایا ہے
دوسری آیت ہے :۔
کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم ۔ تاکہ یہ مال اغنیاء ہی کے درمیان گھومنے والی چیز نہ بن جائے۔
احادیث میں وارد ہے :۔
الناس شرکاء فی الماء والکلاء والنار ان اللہ فرض علی اغنیاء المسلمین فی اموالھم بقدر الذی یسع فقراھم
سب لوگ پانی، سبزہ زار اور آگ میں مشترک حقوق کے مالک ہیں۔ اللہ تعالی نے مالداروں کے مال میں سے فقراء کی ضروریات زندگی کے بقدر صرف کرنا فرض قرار دیا۔
اسی طرح متحدہ عرب جمہوریہ کے اس موقف کے لئے بعض کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کے تجربات بھی مشعل راہ کی حیثیت سے رکھتے ہیں جیسے خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ارشاد گرامی ہے کہ :۔
"اگر مجھے ان چیزوں کا پہلے سے اندازہ ہوتا جو اس وقت درپیش ہیں تو میں مالداروں کے زائد از ضرورت اموال فقراء پر تقسیم کردیتا"۔

بے شک موجودہ زمانے کے حالات کی فطرت نے انہیں کوششوں اور اسلامی تصرفات و تدابیر کے اس رنگ کو اشتراکیت کا نام دینے میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ مگر یہاں یہ واضح رہے کہ ہندوستان کی طرح عربی زبان میں اشتراکیت سے کمیونزم یا مارکسزم مراد نہیں لیتے۔ اس کے لئے عربی زبان میں "شیوعیت" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ ان افکار پر عمل کرنے والوں کو دین سے دُوری ... کا الزام دیا جائے یا یہ کہا جائے کہ ایسے لوگ دین حنیف کے احکام و اوامر سے چشم پوشی اور اغماض برت رہے ہیں۔

(۲) متحدہ عرب جمہوریہ جو عرب نیشنلزم کی دعوت دیتا ہے اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ وطن عربی کو استعماری طاقتوں سے نجات دلانا چاہتا ہے۔ چونکہ عرب لوگ دینی، تاریخی اور لسانی اعتبار سے اتحاد کے زبردست عوامل ہیں، ان کے باہمی مفادات ان کی مصلحتیں، ان کی امیدیں، ان کی مشکلات اور ان کے مصائب یکساں ہیں، لہٰذا متحدہ عرب جمہوریہ ایک ایسی قوم کی تشکیل کرنا چاہتا ہے جو اپنے شاندار ماضی کی طرح مستقبل میں بھی بلند حوصلوں اور شرافت و اخوت کے پیغام کی حامل ہو اور اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ عرب امن عالم اور انسانیت کو استعماری طاقتوں سے نجات دلانے کے لئے شاندار اور موثر کردار ادا کر سکیں۔

بعض لوگ جو یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ مصری قوم اپنی فرعونیت پر فخر و ناز کرتی ہے اور اس قسم کی باتیں صدر جمال عبدالناصر کی زبان سے بھی نکلی ہیں تو یہ محض بہتان و افترا ہے، اس کا مقصد ایک طرف عرب ممالک کے درمیان

اتحاد اسلامی کی روح اور باہمی تعلقات کو کمزور کرنا ہے اور دوسری طرف عرب ممالک اور دنیائے اسلام کے درمیان ایک خلیج پیدا کرنا ہے۔

مصر نے فتنۂ تاتار اور صلیبی جنگوں کے موقع پر جو کردار ادا کیا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اور مصر آج تک اپنی اسی روش پر قائم ہے۔ مصروہ ملک ہے جہاں ہزاروں تشنگانِ علوم اسلامی آتے ہیں۔ وہ ثقافت اسلامی کو فروغ دینے والے وفود کا پرجوش خیر مقدم کرتا ہے اور خود دنیا کے ہر گوشہ میں اپنے سینکڑوں وفود اسی مقصد کے تحت بھیجتا ہے تاکہ دینی اخوت اور باہمی تعاون کو مضبوط تر کیا جائے۔

ہم اپنے دین پر ایمان رکھنے کے ساتھ اپنی وطنی عزت اور اپنے ناموس کی حفاظت کا حوصلہ رکھتے ہیں اور یہ وہ چیز ہے جو ان ناسازگار حالات کو بھی انشاء اللہ ہموار کرے گی اور ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ عرب کے مقبوضہ علاقوں کی بازیابی کے سلسلہ میں آپ جیسے مخلص بھائی ہمارے بہترین معاون ہونگے

(السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ — (عیسٰی سراج الدین)
(سفیر متحدہ عرب جمہوریہ)

علامہ قاری محمد طیب کے مشاہدات و تاثرات

دنیائے اسلام کی عظیم دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے مؤقر جریدہ ماہنامہ "دارالعلوم" کا ایک خاص شمارہ "عالمی موتمر اسلامی قاہرہ نمبر" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس میں حضرت علامہ قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی ایک طویل تقریر شائع ہوئی تھی جو آپ نے قاہرہ کانفرنس میں شرکت کے بعد واپسی پر دیوبند کے ایک استقبالیہ اجلاس میں خطاب فرمائی۔ آپ نے مصر جدید — اور جدید انقلاب کے قائد جمال عبدالناصر کی اسلامی خدمات کے موضوع پر اپنے چشم دید واقعات و تاثرات اپنے روایتی دلکش انداز میں بیان کئے تھے۔ ان سے آپ اندازہ لگایئے کہ مصر اور اس کے صدر ناصر کی ایک تصویر وہ ہے جو امریکی و برطانوی اخبارات و رسائل اور ان کے دیگر سامراجی ہمنواؤں نے پیش کر کے اسلامیانِ عرب اور خصوصاً "مصری مسلمانوں" سے دنیائے اسلام کو متنفر اور دل برداشتہ کرنے کی مذموم کوشش کی ہے۔

اور اسی مصر — اور اس کے محبوب و ہردلعزیز صدر جمال عبدالناصر کی اسلام پسندی اور دینی شیفتگی و محبت کا ایک حسین و جمیل مرقع یہ ہے

جو دنیائے اسلام کی عظیم درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم علامہ قاری محمد طیب نے اپنے مشاہدات وتاثرات کی صورت میں پیش فرمایا ہے۔

آپ کے یہ مشاہدات مؤقر جریدہ ہفت روزہ "شہاب" لاہور کے شکریہ کے ساتھ ہدیہ قارئین ہیں۔

ایک جھلک

صدر مملکت جمال عبدالناصر خصوصیت سے جمعہ کی نماز نوبت بہ نوبت شہر کی مختلف جامع مسجدوں میں ادا کرتے ہیں۔ ان کے لئے مسجد میں کوئی جگہ مخصوص ہوتی ہے نہ پولیس کے ذریعے کوئی انتظام کیا جاتا ہے۔ جہاں جگہ ملتی ہے آکر بیٹھ جاتے ہیں اور نماز ادا کر کے چلے جاتے ہیں۔ پنجوقتہ نمازوں کی بھی پابندی کرتے ہیں۔

اس ملک میں ہر شہر کی مسجدیں عامۃً نہایت شاندار اور کافی آباد ہیں۔ قاہرہ، طنطا، اسکندریہ، غزہ وغیرہ شہروں کی مسجدیں دیکھنے کی نوبت آئی۔ مساجد کے نقشے نہایت پرشوکت اور تعمیری معیاری ہیں۔ ساتھ ہی ان مساجد میں صف بوریہ کے بجائے بیش قیمت قالینوں کا فرش ہے۔ آئمہ ومؤذنین حکومت کی جانب سے تنخواہ دار مقرر ہوتے ہیں۔ نمازوں کے وقت مسجدیں معمور ہوتی ہیں۔ ہر وقت کی نمازوں میں نمازی جوق در جوق آتے ہیں اور مساجد بھری رہتی ہیں۔ اکثر و بیشتر دیکھنے میں آیا کہ مغرب کی نماز کے بعد آئمہ مساجد آدھ پون گھنٹہ وعظ بھی کہتے ہیں۔ مصری قوم میں ملنساری اور

مجبت کا مضمون بہت کافی ہے۔ جب تک زبان وغیرہ کی اجنبیت رہتی ہے، بیگانگی سی محسوس ہوتی رہتی ہے۔ لیکن جب یہ پردہ اُٹھ جاتا ہے اور ضمائر سامنے آتے ہیں اور زبان کی اجنبیت باقی نہیں رہتی تو یہ مصری مصری کی طرح گھل مل جاتے ہیں۔

اکرام ضیف تو بہر حال مسلم قوم کا قومی مزاج ہی ہے جس میں عرب امتیازی شان رکھتے ہیں۔ مصریوں میں بھی عام عربوں کی طرح یہ خو طبیعت ثانیہ ہے اعضاء موتمر کی مدارات وضیافت میں مصر نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، اجلاس میں مندوبین کو بشارت دی گئی   کہ دستور مملکت میں مستقل دفعہ رکھ دی گئی ہے کہ حکومت کا مذہب اسلام ہے اور سرکاری زبان عربی ہو گی۔

اشتراکیت اور اسلام

یہ ایک غلط پروپیگنڈا ہے کہ مصر میں اشتراکیت قبول کر لی گئی ہے۔ اور وہ کمیونزم کے حامی ہیں۔ اول تو اسلام کے ساتھ جس کو سرکاری مذہب تسلیم کیا گیا ہے یہ اصطلاحی کمیونزم جمع ہی نہیں ہو سکتا۔ دوسرے لفظ اشتراکیت سے ان تمام باتوں کا تصور جو کمیونزم کی بنیادیں ہیں، ضروری نہیں ہے۔ اسلام میں بھی ایک گونہ اشتراکیت ملحوظ رکھی گئی ہے اور بہت سی چیزیں فرد کے بجائے پوری قوم کا حق تسلیم کی گئی ہیں جن پر لفظ اشتراکیت کا اطلاق تو ہو گا کمیونزم کا نہیں ہو گا۔ اس لئے ایسی اشتراکیت و عمومیت جو اسلام

کی حدود میں ہے کمیونزم نہیں کہلائی جا سکتی، بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ کمیونزم میں اگر کوئی اچھی چیز اور خوبی کی بات کی گئی ہے تو وہ اسلام ہی کے اصول سے لی گئی ہے، خرابیاں ہیں تو وہ لینے والوں کے ناقص فکر اور جذباتی رو کا نتیجہ ہیں۔ مصر نے بھی اگر شخصی ملک کی افراط کو روک کر ایسی ملکیتوں کو نیشنلائز کر دیا ہے تو اسے کمیونزم نہیں کہا جائے گا۔

بہرحال شخصی املاک کی افراط کو جو حدود اعتدال سے ہٹی ہوں اور ان کا بڑا اثر ملک کی اجتماعی ملک پر پڑ رہا ہو ختم کر کے حدود اعتدال میں لے آنا قابل ملامت نہیں ہو سکتا اور نہ اسے کمیونزم کے طعنہ سے ناقابل ستائش ہی کہا جا سکتا ہے۔ بہرحال موتمر میں بشارت کے نام سے یہ اعلان کیا گیا کہ حکومت کا مذہب اسلام ہوگا نہ کہ کوئی غیر اسلامی ازم۔

یہ بھی اعلان کیا گیا کہ ایک مستقل ریڈیو اسٹیشن صرف قرآن حکیم کی تلاوت کے لئے منظور کیا گیا ہے جس میں روزانہ بارہ گھنٹے تلاوتِ قرآن ہوا کرے گی اور بعد میں قرآنی مطالب کی تفہیم کا بندوبست بھی کیا جائے گا۔ چنانچہ یہ اسٹیشن ہم لوگوں کی موجودگی میں کھولا جا چکا تھا، اور قاری محمود حصری نے جو مصر کے مشہور مجوّد ہیں، یہ تلاوت شروع بھی کر دی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کریم کے ساتھ مصری قوم کو صرف لگاؤ ہی نہیں بلکہ عشق اور شغف ہے۔ پڑھتے بھی لطف سے ہیں اور سنتے بھی لطف سے ہیں، جمعہ کے دن ہر جامع مسجد میں یہ لازمی معمول ہے کہ خطبہ کی اذان سے قبل ایک گھنٹہ ایک مشہور مجوّد جو اس مسجد کے لئے معین طریقہ پر مقرر ہے قرأت کرتا ہے

وہی خطبہ کی اذان بھی دیتا ہے اور وہی امام کے ساتھ نماز کی تکبیرات بھی پکارتا ہے، چنانچہ جامعہ ازہر کی جامع مسجد میں شیخ مصطفیٰ اسمٰعیل جامعہ شافعیہ میں شیخ عبدالباسط عبدالصمد اور جامعہ زینب میں دوسرے ایک مشہور مجود اس عمل کے پابند ہیں۔ اسی طرح تمام جامع کا یہی دستور ہے بجامع قرآن کے لئے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ قبل مسجدیں بھر جاتی ہیں۔ قرآن کریم سے یہ عمومی شغف کسی دوسرے عربی ملک میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ حتیٰ کہ ایک سپاہی جو سڑک پر پہرہ دے رہا ہے، اُسے بھی ذرا فرصت ملتی ہے تو گلے میں سے ٹرانسسٹر نکال کر قرأت سننے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ جامعہ ازہر میں ہر مدرس کے انتخاب میں حافظ قرآن ہونے کی شرط رکھی گئی ہے، اور القرآن کا سنگ بنیاد ہی مستقلاً حفظ قرآن کے لئے رکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حفاظ کی جو کثرت مصر میں دیکھنے میں آئی ہے وہ دوسرے عرب ممالک میں دیکھنے میں نہیں آئی۔

حفاظتِ قرآن

پھر نہ صرف تلاوتِ قرآن بلکہ حفاظتِ قرآن کے ساتھ بھی قوم میں ولولہ اور جوش پایا جاتا ہے۔ یہود بے بہبود نے اپنی روائتی تلبیس کاری اور عیاری سے افریقہ میں جو مصریوں کی تبلیغ کا سب سے بڑا مرکز ہے ایک قرآن شریف تحریف کر کے طبع کرایا اور پھیلا دیا جس میں سے کئی سو آیتیں خارج کر دیں کتنی ہی آئتیں بدل دیں اور کتنے ہی مضحکہ خیز جملے اپنی طرف سے بڑھا دیئے تاکہ افریقہ میں اسلام کی پھیلتی ہوئی رَو رک جائے اور جو مسلمان ہوں

وہ غلط اور مخالف اسلام عقائد و اعمال کے حامل اور داعی ہوں، تاکہ اسلام کی تعلیمات کوشش کر قومیں ہنسیں اور اسلام کم از کم افریقہ میں غیر مقبول ہو جائے۔

یہ شرارت مصری حکومت کے علم میں آئی تو اس نے اسی دم لاکھوں پونڈ کا بجٹ منظور کر کے صحیح قرآن شریف چھپوایا اور اس کے سرورق پر یہود کی اس شرارت کی اطلاع دیتے ہوئے مسلمانوں کو بیدار کیا۔ اور نہ صرف یہ بلکہ افریقہ بھر میں اپنے آدمیوں کو بھیج کر مسلمانوں کے گھروں سے وہ غلط قرآن نکلوائے اور انہیں دریا برد کر کے یہ صحیح طبع شدہ قرآن گھر گھر مفت پہنچا دیا جس سے یہ عظیم فتنہ ختم ہوا اور قرآن کے بارے میں موعودہ حفاظت خداوندی کھل کر نمایاں ہو گئی۔ مصری حکومت کا یہ کارنامہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک مسلم ملک کے اقدامات میں سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے میرا یقین ہے کہ مصر اور مصری قوم کا اس قرآنی شغف ہی نے تیرا رکھا ہے جس سے یہ قوم اپنی بعض بنیادی کمزوریوں کے باوجود ابھی ہوئی ہے، اور ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔

بہر حال موتمر کے اجلاس میں بطور بشارت یہ سنایا گیا کہ حکومت کا مذہب قرآن ہے۔ حکومت کی زبان لسان قرآن ہے۔ حکومت کا نصب العین اشاعتِ قرآن ہے اور اس کا منصوبہ حفاظتِ قرآن ہے، جس سے دنیا کے ممالک کے یہ مندوب علماء متاثر ہوئے اور ان کی ہمدردیاں پہلے سے زیادہ مصر کے ساتھ قائم ہو گئیں۔

مفتوح عربوں کی شاندار فتح

عرب اسرائیل جنگ کے بعد کے حالات و واقعات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے اور اسرائیل اور عربوں کا اپنا اپنا موقف عدل و انصاف کے ترازو میں تولا جائے تو اس صداقت کے اعتراف میں کسی دشمن کے لئے بھی مجال انکار نہیں ہے کہ اسرائیل اور سامراجیوں کے مقابلہ میں عربوں کا پلڑا بھاری اور ان کا موقف واضح اور مبنی بر انصاف ہے اور دنیا کے تمام ذی شعور اور صاحب فہم و فراست انسان یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اسرائیل میدانِ جنگ میں کامیابیاں حاصل کرنے کے باوجود شکست کھا گیا ہے اور "عرب" میدانِ جنگ میں بظاہر وقتی طور پر ناکام ہو کر بھی دنیا کی نگاہ میں کامیاب اور فاتح کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔

کیونکہ چند عرب ممالک ایک مختصر سی یہودی ریاست اسرائیل کو اگر میدانِ جنگ میں شکست فاش دے کر فتح و نصرت کا علم بلند بھی کر دیتے تو اسے زیادہ سے زیادہ مصر، اردن اور شام کی برتری کا نام دیا جاتا اور ان کے سمیت دیگر عرب ممالک میں سامراجیوں کے تسلط اور ان کے غلبہ

سے نجات پانے کی تحریک کبھی جنم نہ لے سکتی تھی، اور خطۂ عرب سے یہود و نصاریٰ کو نکال باہر کرنے کی ہدایتِ نبویؐ پر عمل پیرا ہونے کا احساس کبھی اجاگر نہ ہو سکتا تھا۔ جیساکہ حال ہی میں الجزائر نے اپنے ملک میں مغربی تیل کمپنیوں کو قومی ملکیت میں لے کر مغربی سامراج پر وہ کاری ضرب لگائی ہے جس نے اسرائیلی کامیابیوں کی خوشی سے کہیں زیادہ سامراجیوں پر لرزہ طاری کر دیا ہے اور نہر سویز کی بندش کے بعد ان کی معیشت کو مفلوج کرنے کا ایک اور موثر اور کارگر وار کیا ہے۔

آج جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مصر سے لے کر اردن، سوڈان، الجزائر، سعودی عرب، مراکش، عراق، شام اور کویت تک تمام عرب ممالک میں پوری یکجہتی اور ہم آہنگی کے ساتھ یہود و نصاریٰ کے غلبہ و تسلط سے نجات پانے، تیل، پٹرول، نہر سویز اور دیگر عرب مفادات کی چیزوں کا امریکہ برطانیہ اور اسرائیل کے دیگر سامراجی پشت پناہوں اور ہمنواؤں کے لئے بائیکاٹ کرنے کی ایک ہمہ گیر لہر اٹھ کھڑی ہوئی اور تحریک پیدا ہو گئی ہے یہ صورتِ حال میدانِ جنگ میں چند کامیابیاں حاصل کر لینے سے کبھی بھی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔

اسی موضوع کی اہمیت ملحوظ رکھ کر معاصر ترجمان اسلام لاہور کے مدیر جناب احمد حسین کمال نے بھی وسعتِ فکر اور اصابت رائے کے ساتھ جو حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا ہے وہ صورتِ حال کے صحیح خد و خال معلوم کرنے کے لئے خصوصی توجہ کا محتاج ہے، وہ لکھتے ہیں:-

اس وقت دنیا کی رائے عامہ اسرائیل کو جارح قرار دے رہی ہے، امریکہ اور برطانیہ کو اس جارحیت میں ملوث سمجھ رہی ہے اور یہ یقین رکھتی ہے، کہ عربوں پر جس بے خبری کے عالم میں اور جس انتہائی شدت وہمہ گیری اور عظیم ترین فضائی قوت کے ساتھ سامنے سے پشت پر سے، دائیں سے اور بائیں سے دفعتہً حملہ کیا گیا تھا اس نے صحیح معنوں میں عربوں بالخصوص مصر کو مقابلہ اور دفاع کی مہلت ہی نہیں دی، اس لئے نہ تو اسے باقاعدہ جنگ کہا جا سکتا ہے اور نہ عربوں کی پسپائی کو شکست سے تعبیر کرنا درست ہو سکتا ہے۔

لیکن خود ساختہ انداز فکر کے ساتھ جس قبیل کی تنقیدات کا سلسلہ بعض پاکستانی اخبارات میں شروع کر دیا گیا ہے اور جس کے آغاز کا سہرا مودودی صاحب کے مقدس قلم کے سر ہے۔ اس سے عربوں کے حق اور مظلومیت کی ساری بنیادیں تہ و بالا ہو جاتی ہیں اور اسرائیل اور امریکہ و برطانیہ کے موقف کو تقویت پہنچ جاتی ہے۔ یہ بیک وقت امریکی سامراج کی بھی خدمت ہے یہودی مقاصد کی بھی ہمنوائی ہے، عربوں کے کاز کو کمزور بنانے کی بھی کوشش ہے اور پاکستان کے مفادات کو نقصان پہنچانے کا بھی حربہ ہے۔

عرب دنیا کا حالیہ حادثہ جو محض کچھ صحرائی علاقہ کے اندر پسپائی اور بیت المقدس کے ہاتھ سے نکل جانے تک محدود ہے اتنا المناک نہیں جتنا المناک ۱۹۱۷ء میں ترکی کی شکست کا حادثہ تھا جبکہ تمام عالم اسلام حتیٰ کہ بیت المقدس اور بالواسطہ طور پر حجاز مقدس تک انگریزوں کا غلبہ قائم ہو گیا تھا

وہ حادثہ پورے عالم اسلام کے لئے مرگ ناگہانی کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اس وقت کی مسلم قیادت نے جو مولانا محمد علی مرحوم، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ — مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم جیسے حضرات پر مشتمل تھی ایک لمحہ کے لئے بھی مسلمانوں کے ذہنوں کو پست حوصلہ، شکست خوردہ، احساس کمتری کا شکار، اور یاس زدہ نہیں ہونے دیا اور نہ انہوں نے ترکی کی مفتوح افواج اور ان کے جرنیلوں و سربراہوں پر لعنت وملامت کے تیر برسائے بلکہ انور پاشا، کمال پاشا وغیرہ کو شکست کے باوجود مسلم قوم کا ہیرو بنا کر کھڑا کر دیا اور جنگی شکست کو انگریزی استبداد کے لئے تقویت کے بجائے مسلمانوں کی ذہنی فتح میں تبدیل کر ڈالا۔

مگر اس کے برعکس آج مودودی صاحب جیسے لوگ جو عالمگیر اسلامی قیادت و امارت کا اپنے سوا کسی کو مستحق نہیں گردانتے، عربوں کی معمولی سی عارضی پسپائی کو تمام عربوں کی شکست، تمام مسلمانوں کی ہزیمت اور امریکہ، برطانیہ و اسرائیل کی فتح عظیم ثابت کرنے میں لگ گئے ہیں یا للعجب!

حرفِ آخر

محسنِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانِ اقدس کے مطابق ایک مسلمان کی زندگی تو اس طرح کی ہونی چاہیئے کہ روئے زمین کے کسی ایک مسلمان کو بھی کوئی گزند پہنچتی ہے یا وہ دُکھ درد میں مبتلا ہوتا ہے تو پوری دنیا کے اہلِ اسلام مضطرب اور بے چین ہو جائیں۔

لیکن یہ ایک المیہ ہے کہ عربوں پر اسرائیل اور استعماری طاقتوں کے جارحانہ حملہ کے بعد جماعتِ اسلامی نے انتہائی نازک وقت میں اپنے مسلم عرب بھائیوں کے دکھوں کا مداوا کرنے اور ان کے زخموں پر ہمدردی و غمخواری کا مرہم لگانے کی بجائے اسرائیل کی ہمنوائی اور سامراجیوں کی سُروں میں سُر ملانا شروع کر دیں اور اس جماعت کے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے عرب مسلمانوں کی بے بسی اور مظلومیت کا احساس کئے بغیر اتحادِ ملّی اور وحدت اسلامی کے مضبوط حصار میں زبان و قلم کے تیز دھار پھاوڑے سے گہرے شگاف ڈالنا شروع کر دیئے۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ تاریخ کے عظیم انسانوں کی روایات زندہ کرتے ہوئے متحدہ عرب جمہوریہ کے صدر جمال عبدالناصر نے جب اپنی قوم کے سامنے

اعتراف قصور کے طور پر استعفےٰ پیش کیا تو دنیا میں سامراجیوں (یہود و نصاریٰ) سے کہیں زیادہ جماعتِ اسلامی کے حلقوں نے اس پر مسرت و شادمانی کا اظہار کیا اور تل ابیب کے بعد اگر کہیں جشن منانے کی کیفیت پائی گئی تو وہ صرف ربوہ اور جماعتِ اسلامی کے مختلف دفاتر تھے۔

اسلامیانِ عرب نے اسرائیل سے شکست کھا کر اتنا اضمحلال محسوس نہ کیا تھا جتنے وہ صدر ناصر کے استعفیٰ سے پژمردہ اور مضمحل ہوئے تھے اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ شاہِ اردن سے لے کر شاہ فیصل تک تمام عرب سربراہوں اور وہاں کے تمام باشندوں نے پوری یک جہتی اور ہم آہنگی کے ساتھ صدر ناصر سے استعفیٰ واپس لینے پر اصرار کرتے ہوئے یہ نعرہ لگایا:-

"ہم صرف ناصر کو چاہتے ہیں"

ناصر کا استعفیٰ ہی اس کی عظمت و دیانت کا زندۂ جاوید ثبوت ہے اور یہ اس کا ایک ایسا عظیم کارنامہ ہے جو تاریخِ اسلامی میں سنہری عنوان کی حیثیت سے ہمیشہ تابناک اور درخشندہ رہے گا۔ لیکن جماعتِ اسلامی اور اس کے غلط اندیش ہمنواؤں کی کوتاہ ظرفی ملاحظہ فرمایئے کہ انہوں نے حسد کی آگ میں تلملاتے ہوئے اسلامیانِ عرب کو ذلیل و خوار کرنے اور ان کے زخموں پر نمک پاشی کا افسوسناک کردار ادا کیا اور سامراجیوں کی تائید و حمایت میں وہ اس حد تک تجاوز کر گئے کہ اسلامی غیرت و حمیت رکھنے والوں کو زبانِ حال سے یہ کہنا پڑا ؎

یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

الغرض پاکستان کے نامور ادیب اور خطیب آغا شورش کاشمیری مدیر ہفت روزہ چٹان لاہور نے جماعت اسلامی اور ان کے دیگر ہمنواؤں کے انداز عمل کو ناپسندیدہ قرار دے کر پوری دردمندی اور حمیت اسلامی کے ساتھ جو تحریر فرمایا ہے وہ اہل اسلام کے نہاں خانۂ دل کی حقیقی ترجمانی اور صحیح عکاسی ہے۔ آغا صاحب رقمطراز ہیں :-

" عربوں پر جو بیتی اس کا کسے قلق نہیں۔ ہر مسلمان کا دل پارہ پارہ ہے، افسوس ہے کہ بعض عناصر اس مرحلہ میں بھی صدر ناصر کو مطعون کرنا اپنے جہم وذوکا کا شبارہ سمجھتے ہیں ہم کسی جماعت یا فرد کی نیت پر حملہ نہیں کرتے، لیکن یہ گذارش کرنے میں حق بجانب ہیں کہ ان کی نکتہ چینی کے لئے اور بھی مواقع پیدا ہوسکتے ہیں۔ یہی موقع انہیں مناسب اور برمحل نظر آرہا ہے۔ اس وقت ناصر پر نکتہ چینی کا مقصد ہے کہ ہم خدانخواستہ امریکہ، برطانیہ اور اسرائیل سے اپنی سُریں ملا رہے ہیں، جس فعل یا قول سے دشمنوں کی غیر شعوری طور پر تائید ہوتی ہو اس کو اپنانا یا اس نہج پر چلنا ہمارے نزدیک غیر دانشمندانہ ہے ان عناصر کو ترکی کا طرز عمل ہی سامنے رکھنا چاہیئے، جس نے اس سنگین مرحلہ میں اپنے کردار کو داغدار نہیں ہونے دیا، حالانکہ قبرص کے معاملہ میں وہ مقابلتہً زخم خوردہ ہے۔

اسرائیل، برطانیہ اور امریکہ ناصر کے خلاف اس لئے

متحد ہیں کہ اس کو ختم کر کے وہ عربوں کو بدحوصلہ کرنا چاہتے ہیں۔ دنیا محض اصولوں سے نہیں چلتی اس کو شخصیتوں کا سحر بھی چلاتا ہے۔ اس وقت ناصر دنیائے عرب کی ایک ایسی شخصیت ہے جس کو استعمار کھا جانا چاہتا ہے۔ اگر مسلمانوں میں سے کوئی جماعت، فرد، حکومت یا ادارہ ناصر کو ہدفِ تنقید بناتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ (غیر ارادی طور پر ہی سہی) استعمار کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔

ہفت روزہ چٹان ۲۴ جولائی ۱۹۶۷ء

اِدارۂ صوت الإسلام

شارع جامع مسجد ○ لائلپور